مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ؕ فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ؕ وَمَا هُمْ بِضَآرِّيْنَ بِهٖ مِنْ اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ؕ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِى الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ؕ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖۤ اَنْفُسَهُمْ ؕ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۲)

اللہ کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک کر جس چیز کو انھوں نے سینہ سے لگایا یہ اس کا بیان ہے۔

قرآن مجید میں شیاطین سے متعدد جگہ جنوں اور انسانوں دونوں گروہوں کے مفسدین اور اشرار مراد لیے گئے ہیں، ہمارے نزدیک یہاں بھی دونوں ہی کے اشرار مراد ہیں۔

عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ سے مقصود حضرت سلیمان علیہ السلام کی بادشاہی کا زمانہ ہے۔ عربی زبان کے عام قاعدہ کے مطابق یہاں ایک مضاف محذوف ہے۔ یعنی عَلٰى عَهْدِ مُلْكِ سُلَيْمٰنَ۔

کتابِ الٰہی کی جگہ سحر سازی سے دلچسپی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ان ظالموں نے کتابِ الٰہی کو تو پیٹھ پیچھے ڈال دیا اور سحر و شعبدہ اور علم نجوم وغیرہ جیسے علوم سفلیہ کو جو سلیمان علیہ السلام کے عہد حکومت میں جنوں اور ان کی پیروی کرنے والے انسانوں کے باہمی اشتراک سے رواج پائے، اس کی جگہ اختیار کر لیا۔

سحر و ساحری اور اس قسم کے سفلی اور شیطانی علوم کا چرچا کچھ نہ کچھ تو ہر دور میں رہا ہے لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ میں معلوم ہوتا ہے، ان کے روحانی علوم کے مقابلہ کے شوق میں، شیاطین جن و انس کے ایک طبقہ میں سحر و ساحری کے سیکھنے سکھانے کا رواج بہت بڑھ گیا تھا اور ان مفسدین نے اپنے ان علوم کو مرتب و مدون بھی کر ڈالا تھا۔ بعد کے زمانوں میں جب یہود دینی و اخلاقی انحطاط میں مبتلا ہوئے اور کتاب و شریعت کا ذوق ان کے اندر مردہ ہوا تو قدرتی طور پر اس طرح کی مزخرفات کے سیکھنے سکھانے میں ان کا انہماک بہت بڑھ گیا[۱] اور جیسا کہ قاعدہ ہے ان چیزوں کو تقدس کا رنگ دینے کے لیے وہ ان کو براہِ راست حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف منسوب بھی کرتے رہے ہوں گے اور لوگوں کو ان کا گرویدہ بنانے کے لیے یہ دعویٰ بھی کرتے رہے ہوں گے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام انھیں علوم کے ذریعہ سے وہ کارنامے انجام دیتے رہے ہیں جو ان کی طرف منسوب ہیں۔ آج بھی جو لوگ ان سفلی چیزوں کا ذوق رکھتے ہیں وہ اپنی ان خرافات کی تائید میں حضرت سلیمان علیہ السلام کا حوالہ بہت دیتے ہیں، بعض نقش تو خاص ان کے نام نامی ہی سے منسوب بھی ہیں۔ اس طرح کی ساری چیزیں معلوم ہوتا ہے یہود ہی کے ذریعہ سے ہمارے ہاں منتقل ہوئی ہیں اور یہ اسی

---

[۱] سلاطین باب ۱۷، ۱۶، میں اسرائیل اور یہودا دونوں کا حال اس طرح بیان ہوا ہے "اور انھوں نے خداوند اپنے خدا کے سب احکام ترک کر کے اپنے لیے ڈھالی ہوئی مورتیں یعنی دو بچھڑے بنا لیے اور یسیرت تیار کی اور آسمانی فوج کی پرستش کی اور بعل کو پوجا اور انھوں نے اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کو آگ میں چلوایا اور فال گیری اور جادوگری سے کام لیا۔"

دفترِ ضلالت کے باقیات سیئات میں سے ہیں جن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے عہدِ حکومت میں اشرار جن وانس نے مرتب کیا اور جس کو بعد میں یہود نے فروغ دیا۔

وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ: یہ جملہ بطورِ استدراک یا بطور ایک جملہ معترضہ کے ہے۔ سلسلہ کلام کے بیچ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کو یہود کے لگائے ہوئے الزام سے بری کرنے کے لیے فرمایا کہ سلیمان کا دامن ان علوم سفلیہ کی آلودگیوں سے بالکل پاک ہے، اس نے اس کفر کا ارتکاب کبھی نہیں کیا۔ البتہ یہ شیاطین جن وانس ہیں جنھوں نے ان چیزوں کو اختیار کیا اور پھر لوگوں کو ان مزخرفات کی تعلیم دی۔

یہاں اسلوبِ کلام سے متعلق دو باتیں ذہن میں رکھنے کی ہیں۔ ایک تو اس جملہ معترضہ کی بلاغت کہ اس کو پڑھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ متکلم کو ان علومِ سفلیہ کی نسبت حضرت سلیمان علیہ السلام کی طرف اتنی ناگوار ہے کہ اس کی تردید کے معاملہ میں اس نے اتنا توقف بھی نہیں کیا کہ بات پوری ہو لے۔ بلکہ سلسلۂ کلام کو روک کر فوراً اس کی تردید ضروری سمجھی۔ دوسری یہ کہ یہ تردید ایسے اسلوب سے شروع کی ہے جس سے یہ بات آپ سے آپ نکلتی ہے کہ سحر کا کفر ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو ثابت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ: اوپر والا جملہ، جیسا کہ ہم نے عرض کیا، بطورِ استدراک یا جملہ معترضہ کے ہے، اس وجہ سے اس جملہ کا عطف لازماً مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک تو انھوں نے ان علوم سفلیہ کی پیروی کی جو سلیمانؑ کے عہدِ حکومت میں شیاطین کے ذریعے سے رواج پائے۔ دوسرے اس چیز کی پیروی کی جو بابل کی اسیری کے زمانہ میں دو فرشتوں "ہاروت وماروت" پر اتاری گئی۔

ہاروت وماروت پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟

یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان فرشتوں پر کیا چیز اتاری گئی تھی؟ اس سوال کا جواب عام طور پر مفسرین نے یہ دیا ہے کہ یہ جادو کا علم ہے۔ لیکن یہ جواب کئی پہلوؤں سے کھٹکتا ہے۔

ایک تو یہ کہ اس کا عطف، جیسا کہ ہم نے عرض کیا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ پر ہے جس سے مراد خود قرآن کی تشریح کے مطابق جادو ہے۔ اب اگر اس سے بھی مراد جادو ہی ہے تو اس کے علیحدہ ذکر کرنے کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا۔ عربی زبان میں جب اس طرح معطوف اور معطوف علیہ آئیں تو عام اصول کے مطابق ان میں ایک حد تک مغایرت ہونی چاہیئے۔ بغیر کسی خاص قرینہ کے اہلِ زبان اس عام ضابطہ کی خلاف ورزی نہیں کرتے یہاں دونوں کے ایک ہی چیز ہونے کا نہ صرف یہ کہ کوئی قرینہ موجود نہیں ہے بلکہ قرائن اس کے خلاف ہیں۔

دوسرا یہ کہ اس کے لیے اُنْزِلَ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کا واضح مفہوم یہی سمجھ میں آتا ہے کہ یہ علم اللہ تعالیٰ کا اتارا ہوا تھا۔ اس لفظ میں عنایت اور افادیت کی جو شان ہے اس کو سامنے رکھتے ہوئے سحر جیسی شیطانی، ناپاک اور سراسر باطل بلکہ کفریہ چیز کے لیے اس کا استعمال ذوق پر گراں گزرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں ہے

کہ قرآن مجید میں یہ لفظ چوپایوں اور لوہے وغیرہ جیسی چیزوں کے پیدا کیے جانے کے لیے بھی استعمال ہوا ہے لیکن محض اتنی بات جادو کے لیے اس لفظ کی موزونیت ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں ہے۔ لوہا اور چوپائے وغیرہ تمدنی اور معاشی نقطۂ نظر سے ہمارے لیے نہایت خیر و برکت کی چیزیں ہیں اس وجہ سے ان کے لیے تو اس کا استعمال سمجھ میں آتا ہے لیکن ہمارے علم میں قرآن میں کہیں بھی یہ لفظ کسی ایسی چیز کے لیے استعمال نہیں ہوا ہے جو جادو کی طرح کفریہ اور شیطانی ہو۔ کفار پر عذابِ الٰہی نازل کرنے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوا ہے لیکن کفار پر جو عذاب آتا ہے وہ اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہوتا ہے اور اس سے خدا کی زمین کی تطہیر ہوتی ہے۔

ہمیں اس حقیقت سے انکار نہیں ہے کہ خیر ہو یا شر دنیا میں جو چیز بھی پائی جاتی ہے خدا کی مشیت ہی کے تحت پائی جاتی ہے۔ لیکن خدا کی مشیت کے تحت کسی باطل کو مہلت ملنا اور چیز ہے اور سحر جیسے شیطانی علم کا دو فرشتوں پر اتارا جانا بالکل دوسری چیز ہے۔

تیسرا یہ کہ یہ علم، جیسا کہ الفاظِ قرآن سے واضح ہے، دو فرشتوں پر اتارا گیا تھا۔ اور یہ فرشتے لوگوں کو اس علم کی تعلیم بھی دیتے تھے۔ فرشتوں کے متعلق یہ بات مسلم ہے کہ شرک و کفر کی ہر آلائش سے ان کے دامن پاک ہیں۔ ان کے مزاج اللہ تعالیٰ نے ایسے بنائے ہیں کہ اس طرح کی کسی گندگی کی ان کو کبھی چھوت بھی نہیں لگتی۔ فرشتے ہمیشہ اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق و عدل کے قیام اور خیر و فلاح کی دعوت و تعلیم کا ذریعہ بنے ہیں اور یہی چیزیں ان کے شایانِ شان ہیں۔ اس وجہ سے جادو کے علم کا ان پر اترنا اور ان کا اس کی اشاعت کرنا (اگرچہ کتنی ہی احتیاط کے ساتھ کیوں نہ ہو) عقل سے بعید بات ہے۔ اگر فرشتے اس طرح کے کام کرنے لگ جائیں تو پھر شیاطین کے لیے کیا کام باقی رہ جائے گا۔

چوتھا یہ کہ فرشتوں نے اپنے اس علم کے لیے جو الفاظ استعمال کیے ہیں ان سے بھی کچھ ایسا ہی مترشح ہوتا ہے کہ ان کا علم شیاطین کے سحر سے کچھ مختلف خصوصیات رکھتا تھا۔ شیاطین کا علم تو جیسا کہ قرآن مجید نے خود وضاحت کر دی ہے، یکسر کفر تھا لیکن فرشتوں نے اپنے علم کے لیے فتنہ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ فتنہ کے معنی امتحان اور آزمائش کے ہیں۔ قرآن میں اس سے عموماً وہ چیزیں مراد لی گئی ہیں جو پیدا تو کی گئی ہیں اصلاً انسان کی نفع و بہبود کے لیے لیکن انسان اپنے استعمال کی غلطی سے یا ان کی حد سے بڑھی ہوئی محبت میں گرفتار ہو کر ان کو اپنے لیے فتنہ بنا لیتا ہے۔ جس کے سبب سے وہ مفید ہونے کے بجائے مضر بلکہ مہلک بن کر رہ جاتی ہیں۔ مثلاً مال اولاد کو قرآن مجید میں فتنہ کہا گیا ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں چیزیں بجائے خود شر نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ہیں، اگر انسان ان کے صحیح مقام کو پہچانے تو یہ اس کے لیے دنیا اور آخرت دونوں میں نفع پہنچانے والی بن سکتی ہیں لیکن جب انسان ان کی بے جا محبت میں گرفتار ہو کر ان کے پیچھے خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے تو یہی چیزیں اس کے لیے وبال اور عذاب بن کے رہ جاتی ہیں کیونکہ بعض حالات میں آدمی کو ان کی محبت کفر تک پہنچا کے چھوڑتی ہے۔

یہ سارے پہلو اس بات کے خلاف ہیں کہ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ سے جادو مراد لیا جائے لیکن اگر جادو نہ مراد لیا جائے تو سوال یہ ہے کہ وہ کون سا علم ہے جس کا فرشتوں پر اترنا موزوں بھی ہو اور جس کے انہاک یا غلط استعمال سے وہ خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہوں جو یہاں اس علم میں بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کا انہماک کتاب اللہ سے برگشتہ کرتا ہو، اس کی نوعیت ایک فتنہ کی ہو جس کے غلط استعمال سے آدمی کفر میں پڑ سکتا ہو، اس کو بدطینت لوگ میاں اور بیوی کے تعلقات کو خراب کرنے کے لیے استعمال کر سکتے ہوں۔

اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص کا علم

ہمارے نزدیک اس سے مراد اشیاء اور کلمات کے روحانی خواص و تاثیرات کا وہ علم ہے جس کا رواج یہود کے صوفیوں اور پیروں میں ہوا اور جس کو انھوں نے گنڈوں، تعویذوں اور مختلف قسم کے عملیات کی شکل میں مختلف اغراض کے لیے استعمال کیا۔ مثلاً بعض امراض یا تکالیف کے ازالہ کے لیے یا نظر بد اور جادو وغیرہ کے برے اثرات دور کرنے کے لیے یا شعبدہ بازوں وغیرہ کے فتنوں کا مقابلہ کرنے کے لیے یا محبت اور نفرت کے اثرات ڈالنے کے لیے۔

یہ علم اس اعتبار سے جادو اور نجوم وغیرہ کے علم سے بالکل مختلف تھا کہ اس میں نہ تو شرک کی کوئی ملاوٹ تھی اور نہ اس میں شیطان اور جنات کو کوئی دخل تھا لیکن اپنے اثرات و نتائج کے پیدا کرنے میں یہ جادو ہی کی طرح زود اثر تھا۔ ممکن ہے بنی اسرائیل کو یہ علم بابل کے زمانہ اسیری میں دو فرشتوں کے ذریعہ سے اس لیے دیا گیا ہو کہ اس کے ذریعہ سے بابل کی سحر و ساحری کا مقابلہ کر سکیں اور اپنی قوم کے کم علموں اور سادہ لوحوں کو جادوگروں کے رعب سے محفوظ رکھ سکیں۔ اس بات کی طرف ہمارا ذہن دو وجہ سے جاتا ہے، ایک تو اس وجہ سے کہ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ بابل میں سحر و ساحری اور نجوم کا بڑا زور تھا[1] دوسری یہ کہ یہ بات سنت اللہ کے موافق معلوم ہوتی ہے کہ اگر کسی جگہ ایک غلط علم کا رعب اور زور رہا ہو جس سے مفسد لوگ فائدہ اٹھا رہے ہوں تو وہاں اللہ تعالیٰ اس کے مقابلہ کے لیے اہل ایمان کو کوئی ایسا علم بھی عطا فرمائے جو جائز اور نافع ہو۔

هَارُوتَ وَمَارُوتَ، قرآن سے واضح ہے کہ خدا کے دو فرشتے تھے اس وجہ سے تفسیر کی کتابوں میں ان کے متعلق جو فضول سا قصہ منقول ہے، وہ ہمارے نزدیک بالکل ناقابل التفات ہے۔ وہ ملکوتی صفات ہی کے ساتھ دنیا میں بھیجے گئے تھے اور ملکوتی صفات کے ساتھ ہی یہاں رہے۔ ان کا علم بھی، جیسا کہ عرض کیا گیا، ایک جائز اور مفید علم تھا لیکن یہود نے اپنے اخلاق کی پستی اور مذاق کی خرابی کی وجہ سے اس کو بری نیت سے سیکھا اور برے مقاصد

---

[1] یسعیاہ نبی بابل سے خطاب کر کے فرماتے ہیں: "تیرے جادو کی کثرت اور تیرے سحر کی افراط کے باوجود یہ مصیبتیں پورے طور سے تجھ پر آ پڑیں گی...... تجھ پر مصیبت آ پڑے گی جس کا منتر تو نہیں جانتی...... اب اپنا جادو اور اپنا سحر جس کی تو نے بچپن ہی سے مشق کر رکھی ہے استعمال کر...... اب افلاک پیما اور منجم اور وہ جو ماہ بماہ آئندہ حالات دریافت کرتے ہیں اٹھیں، اور جو کچھ تجھ پر آنے والا ہے اس سے تجھ کو بچائیں۔" (یسعیاہ ۴۷: ۸-۱۳)

ہی میں استعمال کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علم بھی ان کے ہاں سحر و ساحری کا ایک ضمیمہ بن کے رہ گیا اور اس کی دلچسپیوں میں وہ ایسا کھوئے گئے کہ کتاب اللہ سے اوّل تو انھیں کوئی تعلق ہی باقی نہیں رہ گیا اور اگر رہا بھی تو محض عملیات اور تعویذوں کی حد تک کہ فلاں آیت کے پھونکنے سے یہ فائدہ ہوا کرتا ہے اور فلاں آیت کے تعویذ سے یہ اثر پڑتا ہے۔

ممکن ہے یہاں کسی کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ کیا اس طرح کا علم دنیا میں اپنا کوئی وجود بھی رکھتا ہے تو اس کے جواب میں ہماری گزارش یہ ہے کہ اس کا انکار ایک بالکل بدیہی بات کا انکار ہے۔ اگرچہ میں خود اس طرح کے کسی علم کا کبھی عامل نہیں بنا لیکن متعدد بار میرے اپنے تجربہ میں ایسی باتیں آئی ہیں جن کے بعد میرے لیے اس چیز کا انکار ممکن نہیں رہا۔

ہمارا خیال یہ ہے کہ اسی علم کے باقیات ہیں جن کو ہمارے صوفیوں اور پیروں کے ایک طبقہ نے اپنایا اور اس سے انھوں نے لوگوں کو فائدہ بھی پہنچایا بلکہ واقعات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بعض حالات میں اس کی مدد سے انھوں نے جوگیوں اور جوتشیوں وغیرہ کے مقابل میں اسلام اور مسلمانوں کی برتری بھی ثابت کی لیکن اخلاقی زوال کے بعد جس طرح یہود کے ہاں یہ علم، علوم سفلیہ کا ایک ضمیمہ اور دوکانداری کا ایک ذریعہ بن کے رہ گیا اسی طرح ہمارے یہاں بھی یہ صرف پیری مریدی کی دکان چلانے کا ذریعہ بن کر رہ گیا۔ اور حق سے زیادہ اس میں باطل کے اجزا شامل ہو گئے جس کے سبب سے لوگوں پر اس کے اثرات بھی وہی پڑے جو قرآن نے بیان فرمائے۔

فرشتوں کی طرف سے تعلیم سے پہلے تنبیہ

وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ، جس طرح وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ والا ٹکڑا بطور جملہ معترضہ کے حضرت سلیمان علیہ السلام کی بریت کے لیے وارد ہوا ہے اسی طرح یہ ٹکڑا بطور استدراک ان فرشتوں کی بریت کے لیے وارد ہوا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ یہ اپنے اس علم کا اگر کسی پر انکشاف کرتے تو ساتھ ہی اس کو یہ تنبیہ بھی ضرور کر دیتے کہ دیکھو، ہمارا یہ علم ایک فتنہ ہے تو تم اس کو برے مقاصد میں استعمال کر کے کفر میں نہ پڑ جانا بلکہ اس کو صرف اچھے مقاصد ہی میں استعمال کرنا۔

'فتنہ' کا مفہوم

فتنہ کے مفہوم کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی تمام دنیوی نعمتیں، بیوی بچے، مال وجاہ، اقتدار اور سلطنت وغیرہ دو دھاری تلوار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ انسان اگر ان سے صحیح کام لے تو یہ اس کے لیے نعمت ہیں اور اگر ان کی وجہ سے فتنہ میں پڑ جائے تو یہ اس کے لیے عذاب بن جایا کرتی ہیں۔ اسی طرح یہ علم بھی مضرت اور منفعت کے دونوں پہلو اپنے اندر رکھتا ہے۔ اس کو لوگوں کی خدمت میں استعمال کر کے اس سے ثواب بھی کمایا جا سکتا ہے اور اس کو انتشار اور تفریق کا ذریعہ بنا کر اس سے گمراہی اور ہلاکت کا سامان بھی مہیا کیا جا سکتا ہے۔ چونکہ انسان اپنی کمزوریوں کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی قوتوں کو زیادہ تر غلط ہی استعمال کرتا ہے اس وجہ سے فرشتوں نے ایک خیر خواہ معلم کی طرح اپنے سے ہر ربط پیدا کرنے والے کو پہلے سے آگاہ کر دیا کہ ہمارا علم ایک شمشیر دو دم کی حیثیت رکھتا ہے، کوئی اس کو سیکھ کر اس کو برے مقاصد میں نہ استعمال کرے ورنہ اس طرح

وہ کفر و شرک میں مبتلا ہو سکتا ہے۔

یہاں فرشتوں کے تعلیم دینے کے معاملہ کو اس طرح بیان فرمایا ہے جس سے بادی النظر میں یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگوں کو انسانی روپ میں تعلیم دیتے تھے۔ اگر یہ بات ہو تو اس میں کوئی خاص اشکال نہیں ہے۔ متعدد ایسے واقعات کا خود قرآن سے پتہ چلتا ہے جب فرشتے انسانوں کے اندر خود انسانوں کی شکل و صورت میں نمایاں ہوئے ہیں لیکن امکان اس بات کا بھی ہے کہ عملیات کے دلدادہ لوگ کسی خاص قسم کی ریاضت اور چلہ کشی کے ذریعہ سے ان سے روحانی قسم کا ربط پیدا کر کے یہ تعلیم حاصل کرتے رہے ہوں۔ اگر مطلب یہ لیا جائے تو قرآن کے الفاظ میں کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو اس کے خلاف جاتی ہو۔

یہود کی پست مذاقی

وَيَتَعَلَّمُونَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُونَ بِهِ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهِ: یعنی فرشتوں کی مذکورہ بالا تنبیہہ کے باوجود لوگ خاص طور پر ان سے ان عملیات کی تعلیم حاصل کرتے تھے جن کے ذریعے سے شوہر اور اس کی بیوی میں جدائی ڈال سکیں۔ اس ٹکڑے سے یہود کے فساد اخلاق اور ان کی پست ہمتی اور دنائت پر روشنی پڑتی ہے کہ ان کی سب سے زیادہ رغبت اس عمل سے تھی جس کو کسی میاں بیوی کے رشتۂ محبت کو قطع کرنے کے لیے بطور مقراض استعمال کر سکیں، حالانکہ میاں بیوی کے رشتہ کے استحکام پر پورے نظام تمدن کے استحکام کی بنیاد ہے۔ اگر کوئی مذہبی جماعت اپنے علم کو اس بنیاد کے اکھاڑنے میں لگا دے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے شیطان کے کرنے کا جو کام تھا اس کو خود سنبھال لیا۔ جو علم اس مقصد کے لیے استعمال کیا جائے اس سے معاشرے کے صرف غنڈوں اور بدمعاشوں ہی کو نفع پہنچ سکتا ہے اور محبت و نفرت پیدا کرنے کے علم کا اس سے زیادہ مہلک استعمال کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ اس سے صحیح کام بھی لیا جا سکتا ہے جس سے لوگوں کو نفع پہنچ سکتا ہے۔

وَمَا هُمْ بِضَارِّينَ بِهِ مِنْ أَحَدٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ: یہ ٹکڑا بھی بطور استدراک کے ہے یعنی ان عملیات کے شائقین یہ سمجھتے ہیں کہ یہ چیزیں بجائے خود نافع اور ضار ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ اعمال شیطانیہ ہوں یا اعمال روحانیہ، ان سے اگر کسی کو نفع یا ضرر پہنچتا ہے یا پہنچایا جا سکتا ہے تو صرف اللہ کے اذن، اور اس کی مشیت کے تحت۔ یہ چیزیں بذاتِ خود مؤثر نہیں ہیں۔

نفع و ضرر خدا کے اختیار میں ہے

اس استدراک سے اس توحید و اخلاص کو اجاگر کیا گیا ہے جو قرآن کی تمام تعلیمات کی بنیاد ہے۔ ایک موحد کو اس سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ اللہ کی کتاب کے ہوتے ہوئے اوّل تو وہ اس طرح کی چیزوں کی رغبت ہی نہ رکھے ثانیاً اگر ان میں سے کوئی چیز اس کے علم میں آئے تو اس کو مؤثر بالذات نہ مانے۔ نیز اگر اس طرح کی کسی چیز سے اس کو ضرر کا اندیشہ لاحق ہو تو صرف اللہ واحد ہی کی طرف مدد کے لیے رجوع کرے، ٹونوں، ٹوٹکوں اور عاملوں اور سیانوں کے چکر میں نہ پھنسے۔

وَيَتَعَلَّمُونَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ: یہ ٹکڑا سیکھنے والوں کی اخلاقی اور ذہنی پستی کو ظاہر کر رہا ہے۔ جو علم وہ سیکھتے تھے وہ بجائے خود جیسا کہ ظاہر ہوا اپنے اندر نفع و نقصان دونوں کے پہلو رکھتا تھا لیکن سیکھنے والوں

کی ذہنیت وہی ہوتی تھی جو اوپر مذکور ہوئی کہ اس کے ذریعے سے کسی جوڑے کے درمیان تفریق کرائیں، جن میں الفت ہے ان کے درمیان نفرت کے بیج بوئیں، جن میں وصل ہے ان میں فصل پیدا کریں۔ اپنے اس فسادیت کی وجہ سے انھوں نے اس کے نفع کے پہلو کو بالکل ہی ختم کر دیا تھا۔

تورات میں علوم سفلیہ کی ممانعت

وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ : یعنی یہود کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جو لوگ اس طرح کے فتنوں میں پڑیں گے آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ تورات میں نہایت واضح الفاظ میں انھیں ان چیزوں سے روک دیا گیا تھا۔ استثنا باب ۱۸۔ آیات ۹ تا ۱۲ ملاحظہ ہوں۔

"جب تو اس ملک میں جو خداوند تیرا خدا تجھ کو دیتا ہے پہنچ جائے تو وہاں کی قوموں کی طرح مکروہ کام کرنے نہ سیکھنا۔ تجھ میں ہرگز کوئی ایسا نہ ہو جو اپنے بیٹے یا بیٹی کو آگ میں چلوائے یا فال گیر یا شگون نکالنے والا یا افسوں گر یا جادوگر یا منتری یا جنات کا آشنا یا رمال یا ساحر ہو کیونکہ وہ سب جو ایسے کام کرتے ہیں خدا کے نزدیک مکروہ ہیں اور انہی مکروہات کے سبب سے خداوند تیرا خدا تیرے سامنے سے ان کو نکالنے پر ہے۔"

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ان واضح تنبیہات کے باوجود یہود نے ان ساری چیزوں کو اختیار کیا اور ان کا ذوق ان کے اندر اس قدر بڑھ گیا کہ طالوت کو اپنے زمانہ میں پوری قوم کی تطہیر کرنی پڑی۔ چنانچہ سموئیل کے باب ۲۸۔ ۳ میں ہے۔

"اور ساؤل نے جنات کے آشناؤں اور افسوں گروں کو ملک سے خارج کر دیا تھا۔"

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ (۱۰۳)

اس آیت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے آیت ۱۰۱ کو بھی جو اوپر گزر چکی ہے نگاہ میں رکھیے۔ وہاں فرمایا تھا کہ انھوں نے خدا کی کتاب کو پیٹھ پیچھے پھینک دیا اور سحر و نجوم اور گنڈے تعویذ وغیرہ کے فتنوں میں پڑے رہ گئے۔ اب یہاں فرمایا کہ اگر وہ اللہ کے آخری رسول اور اس کی آخری کتاب پر ایمان لاتے اور ان فتنوں سے بچتے جن میں وہ مبتلا ہیں تو اس کا اجر بہت بڑا تھا۔ لیکن یہ اپنی رذالت اور پست ہمتی کی وجہ سے علوم سفلیہ کی ٹو کا اندازہ ہی کو بہت بڑی چیز سمجھتے ہیں۔ انھیں کچھ اندازہ نہیں کہ اللہ کی کتاب پر ایمان اور اس کے بخشے ہوئے علم کا اجر و ثواب خدا کے ہاں کیا ہے۔ کاش وہ اس بات کو سمجھتے۔

۴۳۔ مجموعہ آیات ۹۷-۱۰۳ کی چند اہم باتیں

اس مجموعہ آیات کے اندر بھی چند باتیں ایسی ہیں جو مزید وضاحت کی محتاج ہیں تاکہ اچھی طرح ذہن نشین ہو جائیں۔

ایک یہ کہ بسا اوقات ایک گمراہی یا بدعقیدگی بظاہر معمولی نظر آتی ہے لیکن وہ اپنے اندر اتنی گمراہیاں

چھوٹی گمراہی بڑی گمراہیوں کے دروازے کھول دیتی ہے

اور بدعقیدگیاں چھپائے ہوئے ہوتی ہے کہ اس سے آدمی کے سارے دین وایمان کی جڑیں اکھڑ کے رہ جاتی ہیں۔ یہود قرآن کی مخالفت کے جوش میں حضرت جبریل امین کے بھی مخالف بن گئے اور اس چیز کو انھوں نے ایک معمولی بات سمجھا۔ قرآن نے جب اس کے مضمرات واضح کیے تو معلوم ہوا کہ جبریلؑ کی مخالفت تنہا جبریلؑ ہی کی مخالفت نہیں ہے بلکہ یہ خود اللہ تعالیٰ کی بھی مخالفت ہے، اس کے تمام فرشتوں کی مخالفت ہے اور اس کے تمام رسولوں کی مخالفت ہے۔ پھر ساتھ ہی اس مخالفت کے ایک اور لازمی نتیجہ کو بھی واضح فرمایا جو مذکورہ نتائج سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ وہ یہ کہ جو لوگ ایسے کٹر کافر ہیں کہ اللہ، ملائکہ اور انبیاء سب کے دشمن ہیں۔ اللہ ان کا دوست کس طرح ہو سکتا ہے؛ اس وجہ سے لازماً ایسے کافروں کا اللہ بھی دشمن ہے۔ غور کیجیے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچی۔

اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں

دوسری بات جو مذکورہ بالا اصول ہی پر مبنی ہے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ، اس کے ملائکہ اور اس کے نبیوں اور رسولوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں ہو سکتی۔ ان میں سے کسی ایک کی بھی تکذیب سب کی تکذیب اور کسی ایک کی بھی دشمنی سب کی دشمنی ہے، اس وجہ سے مسلمانوں کا عقیدہ یہ بتایا گیا ہے کہ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ (۲۸۵- بقرہ) (اس کے رسولوں کے درمیان ہم کسی قسم کی تفریق نہیں کرتے) مزید غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اسی اصول پر وہ حدیث بھی مبنی ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ من عادی لی ولیا فقد بارزنی بالحرب (جس نے میرے کسی دوست کے ساتھ دشمنی کی تو اس نے خود مجھے اعلانِ جنگ دیا) اس کی وجہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے جاننے اور ماننے والے ہیں وہ درحقیقت اسی ملت اور اسی حزب سے تعلق رکھتے ہیں جس میں انبیاء و رسل اور ملائکہ شامل ہیں۔ جس طرح ان میں سے کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف جنگ ہے اسی طرح صلحاء و ابرار میں سے بھی کسی کی دشمنی بالواسطہ اللہ تعالیٰ کے خلاف اعلانِ جنگ ہے۔

کتاب اللہ سے صحیح ربط کے لیے ضروری شرط

تیسری یہ کہ جس طرح سحر، شعبدہ، نجوم، حاضرات، فال اور کہانت وغیرہ کے قسم کی چیزیں خدا اور اس کی شریعت سے انسان کو برگشتہ کر دینے والی ہیں، اسی طرح اشیا اور کلمات کے روحانی خواص یعنی گنڈے تعویذ اور جھاڑ پھونک کا علم بھی انسان کے لیے ایک فتنہ اور کتاب و شریعت سے منحرف کرنے والا ہے۔ کتاب اللہ کے ساتھ مضبوط اور مستحکم ربط پیدا کرنے کے لیے صحیح راہ یہی ہے کہ آدمی نہ صرف سحر و ساحری سے دور رہے بلکہ اس دوسری قسم کی چیزوں سے بھی حتی الوسع احتراز ہی کرے۔ انسان جب عملیات وغیرہ کے چکر میں پھنس جاتا ہے تو اس فتنہ میں لازماً گرفتار ہو جاتا ہے جس سے ہاروت و ماروت نے متنبہ کیا تھا اور پھر ان تمام مفاسد کا ظہور میں آنا لازمی ہے جو یہود کے ہاتھوں ظہور میں آئے اور جن کے سبب سے وہ کتاب اللہ کی روشنی سے محروم ہو گئے۔

۴۴۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۰۴-۱۲۱

عربوں کو گمراہ کرنے کے لیے یہود کی شرارتیں

آگے مسلمانوں کو یہود کی بعض ان شرارتوں سے آگاہ کیا گیا جو وہ اس غرض سے کر رہے تھے کہ بنی اسماعیل کو عموماً اور مسلمانوں کو خصوصاً قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی سعادت سے محروم کریں۔ اس ضمن میں یہود کے بعض ایسے اعتراضات نقل کر کے ان کے جواب بھی دیے ہیں جو وہ مسلمانوں کے دلوں میں شک و شبہ پیدا کرنے کے لیے اٹھاتے تھے اور وہ ہدایات بھی دی ہیں جن پر عمل کر کے مسلمان ان فتنوں کے مقابل میں راہِ حق پر استوار رہ سکتے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۰۴-۱۲۱

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۭ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۰۴﴾ مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۱۰۵﴾ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۶﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۰۷﴾ اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔــلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ﴿۱۰۸﴾ وَدَّ كَثِيْرٌ مِّنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّوْنَكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ اِيْمَانِكُمْ كُفَّارًا ښ حَسَدًا مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۚ فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۰۹﴾ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا

تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۱۱۰﴾ وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ
هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۱۱﴾ بَلٰى ۚ مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ
اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ۪ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَقَالَتِ
الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَیْءٍ ۪ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ
عَلٰى شَیْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ
مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا
فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ
يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ
اَنْ يَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْيَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ
فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا
تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۱۵﴾ وَقَالُوا اتَّخَذَ
اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ
لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ﴿۱۱۶﴾ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا
فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا
يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَاۤ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ
مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾

ع ۱۳ ۹ ۱۳

إِنَّآ أَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ أَصْحٰبِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۱۹﴾ وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ؕ قُلْ إِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ؕ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿۱۲۰﴾ وقف منزل الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ أُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ ع ۱۴ ۱۴

ترجمہ آیات ۱۰۴-۱۲۱

اے ایمان والو تم 'راعنا' نہ کہا کرو 'انظرنا' کہا کرو اور توجہ سے سنا کرو۔ کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا، اہل کتاب ہوں یا مشرکین، نہیں چاہتے کہ تمھارے اوپر تمھارے رب کی طرف سے کوئی رحمت نازل ہو۔ اور اللہ اپنی رحمت کے لیے خاص کرتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۱۰۴-۱۰۵

جو کوئی آیت ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں۔ کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تمھیں نہیں معلوم کہ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور تمھارے لیے اللہ کے سوا کوئی دوست ہے اور نہ مددگار۔ ۱۰۶-۱۰۷

کیا تم چاہتے ہو کہ اپنے رسول سے اس طرح کے سوال کرو جس طرح کے سوال اس سے پہلے موسیٰ سے کیے گئے اور جو لوگ ایمان کو کفر سے بدل لیں گے وہ شاہراہ سے بھٹک گئے ۱۰۸

بہت سے اہل کتاب یہ چاہتے ہیں کہ وہ تمھارے ایمان کے بعد پھر تمھیں کفر کی حالت میں پلٹا دیں، محض اپنے حسد کی وجہ سے، حق کے اچھی طرح واضح ہو جانے کے باوجود تو درگزر کرو اور

نظر انداز کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اور جو نیکی بھی تم اپنے لیے کروگے اسے اللہ کے پاس پاؤ گے۔ جو کچھ تم کر رہے ہو خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۰۹-۱۱۰

اور کہتے ہیں کہ جنت میں نہیں داخل ہو سکتے مگر وہ جو یہودی ہیں یا نصرانی۔ یہ محض ان کی آرزوئیں ہیں۔ کہو اس بات پر اپنی دلیل پیش کرو اگر تم سچے ہو۔ ہاں بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیا اور وہ ٹھیک طرح سے عمل کرنے والا ہے تو اس کے لیے اس کا اجر اس کے رب کے پاس ہے، نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ اور یہود نے کہا کہ نصاریٰ کی کوئی بنیاد نہیں اور نصاریٰ نے کہا یہود کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور یہ دونوں کتاب کی تلاوت کرتے ہیں۔ اسی طرح کی بات ان لوگوں نے بھی کہی جن کو علم نہیں ہے۔ تو اللہ قیامت کے دن اس معاملہ کا فیصلہ کرے گا جس میں یہ جھگڑ رہے ہیں۔ ۱۱۱-۱۱۳

اور ان سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ کی مساجد کو اس بات سے محروم کریں کہ ان میں اس کا ذکر کیا جائے اور ان کی ویرانی کے درپے ہوں۔ ان کے لیے زیبا نہ تھا کہ ان میں داخل ہوتے مگر ڈرتے ہوئے۔ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے اور مشرق ہو یا مغرب دونوں اللہ ہی کے ہیں تو جدھر بھی رخ کرو اسی طرف اللہ ہے، اللہ بڑی گنجائش رکھنے والا اور علم والا ہے۔ ۱۱۴-۱۱۵

اور کہتے ہیں کہ خدا اولاد رکھتا ہے۔ اس کی شان ان باتوں سے ارفع ہے بلکہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے سب اسی کا ہے۔ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔ وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے اور جب وہ کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس اس کے لیے فرما دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ ۱۱۶-۱۱۷

اور جو لوگ علم نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ اسی طرح جو لوگ ان سے پہلے گزرے ہیں انھوں نے بھی انھی کی طرح کی بات کہی۔ ان سب کے دل ایک ہی جیسے ہو گئے۔ جو لوگ یقین کرنے والے ہیں ان کے لیے ہم نشانیاں اچھی طرح واضح کر چکے ہیں۔ ہم نے تمھیں حق کے ساتھ بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے اور تم سے دوزخ میں جانے والوں کے بارے میں کوئی پرسش نہیں ہو گی۔ ۱۱۸-۱۱۹

نہ یہود تم سے راضی ہونے والے ہیں اور نہ نصاریٰ تاوقتیکہ تم انھی کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ ان سے کہو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصل ہدایت ہے۔ اور اگر تم اس علم حقیقی کے بعد جو تمھارے پاس آ چکا ہے ان کی خواہشوں پر چلے تو اللہ کے مقابل میں نہ تمھارا کوئی دوست ہو گا اور نہ کوئی مددگار۔ ۱۲۰

جن لوگوں کو ہم نے کتاب بخشی اور وہ اس کے پڑھنے کا حق ادا کرتے ہیں وہی لوگ اس (قرآن) پر ایمان لائیں گے اور جو اس کا انکار کریں گے تو وہی گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔ ۱۲۱

۴۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا وَلِلْکٰفِرِیْنَ عَذَابٌ اَلِیْمٌ (۱۰۴)

رَاعِنَا کا مفہوم

رَاعِنَا مراعات سے امر کا صیغہ ہے۔ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو تو متکلم کو پھر متوجہ کرنے کے لیے عربی میں رَاعِنَا کا لفظ ہے یعنی ذرا ہمارا لحاظ فرمائیے، پھر ارشاد ہو۔ جس طرح انگریزی میں (I BEG YOUR PORDON) ہے عربی میں اسی موقع و محل کے لیے اُنْظُرْنَا کا لفظ بھی ہے۔ نظر سے امر کا صیغہ ہے۔ اس کے معنی دیکھنے، مہلت دینے، انتظار کرنے اور توقف کرنے کے ہیں۔

آنحضرت صلعم کی مجلس میں یہود کی شرارت

اوپر گزر چکا ہے کہ یہ یہود کی ان شرارتوں اور اعتراضات سے متنبہ کیا جا رہا ہے جو وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے خلاف اس لیے کرتے تھے کہ اپنے دلوں کی بھڑاس نکالیں اور ہو سکے تو اس طرح مسلمانوں

کو اسلام کی نعمت عظمیٰ سے محروم کریں۔ سیاق و سباق پر نگاہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض یہودی محض منافقانہ اغراض کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں شریک ہوتے اور اپنے شوق استفادہ و ذوق تعلم کے اظہار کے طور پر رَاعِنَا کا لفظ بار بار دہراتے تاکہ حاضرین مجلس پر یہ اثر ڈالیں کہ یہ علم کے بڑے طالب اور قدر دان لوگ ہیں۔ حالانکہ یہ لوگ اس لفظ کو صرف اس لیے استعمال کرتے تھے کہ ذرا سا زبان کو توڑ مروڑ کر استعمال کرنے سے اس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کا پہلو پیدا کیا جاسکتا تھا۔ رَاعِنَا کو ذرا نیچے کی طرف دبا کر ادا کیجیے تو بڑی آسانی سے رَاعِيْنَا بن جائے گا جس کے معنی ہمارے چرواہے کے ہیں۔ یہود کی اس شرارت کا ذکر قرآن مجید میں دوسری جگہ بھی ہے۔ مِنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُوْلُوْنَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِاَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّيْنِ (یہود میں وہ لوگ بھی ہیں جو کلام کو اس کے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں اور اپنی زبانوں کو لچکا کر کہتے ہیں سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ اور رَاعِنَا دین پر طنز کرنے کے لیے) اس آیت سے واضح ہے کہ یہ شرارت رَاعِنَا کے تلفظ میں زبان لچکا کر پیدا کی جاتی تھی۔ اسی طرح عَصَيْنَا کو اس طرح ادا کرتے کہ سننے والے کو اَطَعْنَا کا دھوکا ہو اور اِسْمَعْ کہتے ہوئے ذرا زبان دبا کر اس کے ساتھ چپکے سے غَيْرَ مُسْمَعٍ بھی لگا دیتے۔ یعنی ذرا ان کی ناشنیدنی سنو۔ مقصود ان شرارتوں سے جیسا کہ قرآن نے واضح فرمایا، اسلام اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر طنز کرنا اور پھبتی چست کرنا ہوتا۔

الفاظ سے متعلق ایک نفسیاتی حقیقت

چونکہ یہود یہ طنز، جیسا کہ اوپر گزرا، اپنے دل کی بھڑاس نکالنے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی توہین کرنے اور آپ کو مسلمانوں کی نگاہوں سے گرانے کے لیے کرتے تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس لفظ ہی کو مسلمانوں کے مجلسی الفاظ سے یک قلم خارج کر دیا اور اس کی جگہ زبان کا دوسرا معروف لفظ استعمال کرنے کا حکم دیا جو طنز کے شائبہ سے پاک تھا۔ الفاظ کے متعلق یہ نفسیاتی حقیقت ملحوظ رہنی چاہیے کہ اگر ان کے اندر کوئی روح فساد موجود ہو یا سوء استعمال سے پیدا کر دی گئی ہو تو پھر سلامتی ان سے دور رہنے ہی میں ہے ورنہ ان کا زہر غیر شعوری طور پر ان کے بولنے والوں اور سننے والوں کے اندر بھی سرایت کر کے رہتا ہے۔ مسلمانوں کو اس چھوت سے بچانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے رَاعِنَا کے استعمال کی ممانعت فرما دی۔

پھر اس کا ایک اور فائدہ بھی ہوا وہ یہ کہ "رَاعِنَا" کی ممانعت اور "انظرنا" کی اجازت نے مخلصین اور منافقین کے درمیان ایک نشان امتیاز بھی پیدا کر دیا اور صریح ممانعت کے بعد ظاہر ہے کہ مجلس نبوی میں اس لفظ کے استعمال کی جسارت وہی لوگ کر سکتے تھے جن کے دلوں کے اندر حسد اور کینہ توزی کا اتنا بخار بھرا ہوا ہو کہ وہ کسی طرح بھی اس کو دبا سکنے پر قادر نہ ہوں۔

اس آیت میں "اسمعوا" کا لفظ اپنے کامل اور حقیقی مفہوم میں ہے۔ یعنی غور سے پیغمبر کی باتیں سنو اور ان کو سمجھو تاکہ تمہیں بار بار پیغمبر کو متوجہ کرنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ اس میں ایک لطیف اشارہ

اس بات کی طرف بھی ہے کہ یہ یہود نہ تو سننے کے لیے آتے ہیں اور نہ سمجھنے کے لیے بلکہ صرف اس لیے آتے ہیں کہ کوئی موقع رٰعِنَا کے استعمال کا پیدا کر کے اپنے دل کا بخار نکالیں۔

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۱۰۵)

معاندین کے باطن پر روشنی

یہ آیت معاندین اسلام کے باطن پر عکس ڈال رہی ہے اور خطاب مسلمانوں سے ہے کہ مسئلہ صرف ایک لفظ کے استعمال اور عدم استعمال کا نہیں ہے بلکہ یہ یہودی اور یہ مشرکین دونوں اس غصہ اور حسد میں جل رہے ہیں کہ تم خدا کی طرف سے اس خیر عظیم کے سزاوار کس طرح قرار پائے۔ ان کے نزدیک تو سارے خیر و شرف کے وارث و مورث یہ تھے نہ کہ تم قلاش اور بے سروسامان مسلمان۔ لیکن جب وہ دیکھ رہے ہیں کہ ان کے علی الرغم تمھاری طرف سب سے بڑے خیر کی وراثت منتقل ہو رہی ہے اور تم اس کے حامل ہوا چاہتے ہو تو انھوں نے اس قسم کی چھچھوری حرکتیں شروع کر دی ہیں کہ اگر ہو سکے تو اس طرح تمھاری نظروں میں اسلام اور پیغمبر آخرالزماںؐ کی وقعت کچھ گھٹائیں تاکہ جس طرح وہ خود اس نعمت سے محروم ہیں تم بھی اس سے محروم ہی رہو۔ تم ان کی ان چالوں سے ہوشیار رہو اور ان کے چکموں میں آ کر ان کی تمنا بر آنے کے سامان نہ کرو۔ پھر فرمایا کہ اللہ نے اپنے فضل و رحمت کا اجارہ دار نہ یہود کو بنایا ہے نہ قریش کے سرداروں کو بلکہ وہ اپنے فضل و رحمت کا خود مالک و مختار ہے۔ وہی اپنی صواب دید اور اپنی حکمت کے تقاضوں کے مطابق جس کو چاہتا ہے اس سے نوازتا ہے۔

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ۭ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۰۶)

النسخ کا مفہوم

نسخ کے اصل معنی ہٹانے اور مٹانے کے ہیں۔ قرآن مجید میں ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (۵۲-الحج) (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے۔ پھر اللہ اپنی آیتوں کو محکم کرتا ہے) یہاں یہ ایک قانون کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرا قانون لانے کے لیے استعمال ہوا ہے۔ انساء کے معنی فراموش کر دینے کے ہیں۔

یہود کی وسوسہ اندازی کی تردید

یہود مسلمانوں کے دلوں میں یہ وسوسہ ڈالتے تھے کہ جب قرآن حضرت موسیٰؑ کو خدا کا پیغمبر اور تورات کو خدا کی کتاب تسلیم کرتا ہے تو پھر تورات کے احکام کے ردوبدل کے کیا معنی؟ کیا خدا اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کو خود اپنے ہی ہاتھوں بدلتا ہے۔ کیا اب تجربہ کے بعد خدا پر اپنی غلطیاں واضح ہو رہی ہیں اور وہ ان کی اصلاح کر رہا ہے؟

اس قسم کے اعتراضات اٹھا کر یہود مسلمانوں کو قرآن اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے بدگمان کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ قرآن نے یہاں ان کا جواب دیا ہے کہ تورات کا جو قانون منسوخ کیا جاتا ہے اس سے

بہتر قانون اس کی جگہ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح تورات کے جو احکام یہود نے فراموش کر دیے تھے، ان کی تجدید کی جاتی ہے اور اگر تجدید نہیں کی جاتی بلکہ ان کو نظر انداز کرایا جاتا ہے تو ان سے ملتے جلتے احکام دیے جاتے ہیں، یعنی اس تبدیلی سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ایک تو خوب سے خوب تر کی طرف بڑھا رہا ہے، دوسرے دین کی جو دولت ضائع کر دی گئی تھی اس کی جگہ دین کے خزانہ کو نئی دولت سے معمور کر رہا ہے۔ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جو قابلِ اعتراض قرار دی جا سکے۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ: یہ خطاب عام ہے۔ ان لوگوں سے بھی جو یہ وسوسہ اندازی کر رہے تھے اور ان لوگوں سے بھی جو اس وسوسہ اندازی سے متاثر ہو رہے تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ یہود کو شریعت دے کر اپنی قدرت اور اپنے اختیار سے مستعفی نہیں ہو بیٹھا تھا کہ اب نہ تو وہ دنیا میں کسی کو شریعت دے گا، نہ اس میں کسی قسم کی ترمیم و تبدیلی کرے گا اور نہ اب وہ اس کی تجدید کرے گا اگرچہ یہ اس کو بالکل ہی برباد کر کے رکھ دیں۔ بلکہ وہ بدستور اپنے تمام اختیارات کا مالک ہے اور اپنی حکمت کے مطابق ان کو ہمیشہ استعمال کرتا رہا ہے اور کرے گا۔

اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ (۱۰۷)

تردید کا ایک خاص پہلو

یہاں بھی مخاطب وہی ہیں جو اوپر والی آیت میں مخاطب ہیں۔ البتہ جواب میں اس ذہنیت کو ملحوظ رکھ کر جو مذکورہ بالا سوال کے پس پردہ چھپی ہوئی تھی، تھوڑی سی تفصیل آگئی ہے۔ یہود نسخ کے سوال کو اٹھا کر سادہ لوح لوگوں کے اندر جو وسوسہ اندازی کر رہے تھے اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ وہ اس بات کو تاڑ گئے تھے کہ یہ تورات کے احکام کا منسوخ ہونا اور ان کی جگہ دوسرے احکام کا آنا محض تورات کے بعض احکام ہی کا منسوخ ہونا نہیں ہے بلکہ اس کے اندر یہود کی منصب امامت سے معزولی اور ان کی جگہ ایک دوسری امت کے نصب و تقرر کا پیام بھی مضمر ہے۔ دراصل اس چیز کا غم و غصہ تھا جو انہیں کھائے جا رہا تھا اور اس کے اظہار کے لیے وہ نسخ کے سوال کو ایک پردہ کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ قرآن نے اس پردے کو اٹھا کر ان کو یہ جواب دیا کہ آسمان و زمین کی بادشاہی اللہ ہی کی ہے اور اسی کے اختیار میں ہے۔ وہ جس سے چاہتا ہے اس کو چھینتا ہے اور جس کو چاہتا ہے بخشتا ہے، اب اگر تم اس منصب کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہو جس پر اس نے تم کو سرفراز کیا تھا اور اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری جگہ اس منصب پر کسی اور کو سرفراز فرمائے تو تمہارے غم و غصے کے علی الرغم یہ بات ہو کے رہے گی اور تمہارا کوئی حامی و مددگار خدا کے اس فیصلہ سے تمہیں نہیں بچا سکتا۔

اَمْ تُرِیْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُىِٕلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ یَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِیْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۰۸)

لفظ 'سوال' کا مفہوم

لفظ سوال کے اندر کئی مفہوم ہیں۔ مثلاً مانگنا، درخواست کرنا، مطالبہ کرنا، پوچھنا، پرسش کرنا، سوال کرنا۔

سوال بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس وجہ سے اس کے مفہوم میں اعتراض کرنا بھی داخل ہے۔ بعض حالات میں تحقیق کی نوعیت کا ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ عن کے ساتھ آتا ہے۔ بعض حالات میں سوال استہزا کی نوعیت کا بھی ہوتا ہے، اس صورت میں اس کا صلہ 'ب' کے ساتھ آتا ہے مثلاً سَاَلَ سَآئِلٌ بِعَذَابٍ وَّاقِعٍ ۔ معارج ۱ (ایک مذاق اڑانے والے نے مذاق اڑایا ہونے والے عذاب کا) قرآن مجید میں یہ لفظ مذکورہ تمام معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہاں موقع کلام دلیل ہے کہ یہ لفظ معترضانہ سوال کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

یہاں مخاطب مسلمانوں کے اندر کے وہ کمزور لوگ ہیں جو یہود کے القا کیے ہوئے مذکورہ بالا سوال سے متاثر ہو کر اس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کرتے اور اس طرح اس سوال کے اٹھانے اور پھیلانے میں مسلمانوں کے اندر یہود کی نمائندگی کرتے۔ قرآن نے سوال کا جواب تو اوپر دے دیا تاکہ یہود کے پروپیگنڈے کا رد ہو جائے لیکن جس طرح اوپر والی آیت میں یہود کو تنبیہ کی اسی طرح مسلمانوں کے اندر ان کی نمائندگی کرنے والوں کو یہاں تنبیہ کی۔ یہ سوالات اپنی ذہنیت اور نوعیت کے اعتبار سے اسی طرح کے سوالات ہیں جس طرح کے سوالات یہود حضرت موسیٰ سے کرتے رہے ہیں اور یہ روش ایمان وہدایت کی روش نہیں ہے بلکہ ایمان کو کفر سے بدلنے کی روش ہے۔ جو لوگ یہ روش اختیار کرتے ہیں وہ یہود ہی کی طرح جادۂ مستقیم سے بھٹک کے رہتے ہیں۔

چونکہ اس سوال کے پس پردہ درحقیقت یہود ہی تھے اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کے کہ اسی طرح کے سوالات اس سے پہلے موسیٰ سے کیے گئے، بڑی بلاغت کے ساتھ ان کی طرف اشارہ کر دیا ہے تاکہ ان پر واضح ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ان کی وسوسہ اندازیوں سے بے خبر نہیں ہے۔

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمٰنِكُمْ كُفَّارًا ۚ حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتّٰى يَأْتِيَ اللّٰهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ (۱۰۹)

مزید تنبیہ ہے کہ یہود کی یہ تمام سرگرمیاں صرف اس غرض سے ہیں کہ تمہیں ایمان سے ہٹا کر پھر کفر کی حالت میں پلٹا دیں۔ یہ نہ سمجھو کہ ان کی یہ تمام بھاگ دوڑ تمہاری خیر خواہی میں ہے یا یہ تمہارے سابق دین کو برحق سمجھتے ہیں اس کی حمایت میں ہے یا اسلام کے باب میں انھیں کوئی غلط فہمی ہے اس وجہ سے ہے بلکہ یہ محض حسد کا دورہ ہے جو ان کے نفس کی تحریک سے ان پر پڑا ہے باوجودیکہ اسلام کا حق ہونا ان پر اچھی طرح واضح ہو چکا ہے۔

یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ بعض نیک دل یا سادہ لوح مسلمان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو سکتے تھے کہ یہ اہل کتاب محض ان کی خیر خواہی میں یا ایک دینی خدمت کے طور پر ان کے ایمان کے معاملہ میں اتنے سرگرداں ہیں۔ قرآن نے اس غلط فہمی کو رفع کر دیا کہ یہ سب کچھ محض حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم ہے یعنی یہ کسی جذبہ دینی

کے تحت نہیں ہے بلکہ محض نفس کے ابھارے ہوئے جذبہ حسد کی کرشمہ سازی ہے۔

یہود کو تہدید

فَاعْفُوْا وَاصْفَحُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ: عفو کے ایک معنی تو دل سے معاف کر دینے کے ہیں اور دوسرے معنی کسی کو نظر انداز کر دینے کے بھی ہیں۔ مثلاً یُبَیِّنُ لَکُمْ کَثِیْرًا مِّمَّا کُنْتُمْ تُخْفُوْنَ مِنَ الْکِتٰبِ وَیَعْفُوْا عَنْ کَثِیْرٍ ۱۵۔ مائدہ (اور تمہارے لیے بیان کرتا ہے بہت سی وہ چیزیں جو تم کتاب کی چھپاتے تھے اور بہت سی چیزوں کو نظر انداز کرتا ہے) صفح کے معنی چشم پوشی کرنے اور نظر انداز کرنے کے ہیں۔ کسی حماسی کا شعر ہے

صفحنا عن بنی ذهل وقلنا القوم اخوان

ہم نے بنی ذہل کی شرارتوں سے چشم پوشی کی اور خیال کیا کہ یہ لوگ اپنے ہی بھائی ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ ابھی کچھ دنوں ان یہودیوں کی شرارتوں کو نظر انداز کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ان کے بارے میں اپنا فیصلہ صادر فرمائے۔ یہ پوری آیت یہود کے لیے تہدید و وعید ہے اور اس بِاَمْرِهٖ کے اجمال کے اندر وہ ساری باتیں چھپی ہوئی ہیں جو بعد میں یہود کے ساتھ جنگ کے حکم، ان کی ہزیمت اور قتل و جلاوطنی اور ادائے جزیہ وغیرہ کی شکل میں ظاہر ہوئیں۔

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۱۱۰)

مخالفین کی مخالفتوں کا علاج

یہ مسلمانوں کو معاندین اسلام کی مخالفتوں کا علاج بتایا گیا ہے کہ اگر تم ان فتنوں پر غالب آنا چاہتے ہو تو نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو اسی سے تمھاری وہ روحانی و اخلاقی تربیت ہوگی جو تمہیں ایک طرف تو مخالفین کی وسوسہ اندازیوں سے بالکل مامون کر دے گی، دوسری طرف تم کو جماعتی حیثیت سے ایک ایسی بنیان مرصوص بنا دے گی کہ کوئی طاقت بھی تمھیں ہلا نہ سکے گی۔ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کو تمام دین کی بنیاد، تمام تربیت و اصلاح کی اساس اور تمام قوت و طاقت کا سرچشمہ قرار دیا گیا ہے۔ دوسری ساری چیزوں کو ان کے تابع قرار دیا گیا ہے۔ مکی سورتوں میں جہاں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو دشمنوں کے مقابل میں صبر و استقامت کی تلقین کی گئی ہے وہاں نماز کی تاکید کی گئی ہے۔ اسی بقرہ میں تحویل قبلہ کے حکم کے بعد جب مخالفت کا طوفان اٹھا ہے تو فرمایا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۱۵۳۔ بقرہ (اے ایمان والو، صبر اور نماز کے ذریعہ سے مدد چاہو بے شک اللہ ثابت قدموں کے ساتھ ہے) اسی طرح جو لوگ مضبوط تربیت کے بغیر جنگ و جہاد کے لیے جلدی مچاتے تھے ان کو نماز و زکوٰۃ کے ذریعہ سے اپنی تربیت کرنے کی ہدایت کی گئی۔ کُفُّوْۤا اَیْدِیَکُمْ وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ (ابھی اپنے ہاتھ روکو اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو) سورہ حج میں مسلمانوں کو جہاد کا حکم دینے کے بعد ہدایت فرمائی کہ فَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ۔ (پس نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو مضبوط پکڑو) یہاں بھی نماز اور زکوٰۃ کا حکم اسی پہلو سے ہے۔ اس پر مزید بحث آگے

آئے گی۔

وَقَالُوْا لَنْ يَّدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ؕ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ ؕ قُلْ هَاتُوْا بُرْهَانَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۱۱)

هُوْد۔ هائد کی جمع ہے۔ اس کی تحقیق آیت ۶۲ میں گزر چکی ہے۔

مسلمانوں کو بہکانے کے لیے یہود و نصاریٰ کا مشترکہ پروپیگنڈا

جس طرح نسخ کا اعتراض مسلمانوں کے دلوں میں شک اور تردد پیدا کرنے کے لیے اٹھایا گیا اسی طرح یہ پروپیگنڈا بھی یہود اور نصاریٰ دونوں کی طرف سے کیا گیا کہ نجات حاصل کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو یہ ہے کہ آدمی یہودیت اختیار کرے یا نصرانیت، یہ دونوں خدائی دین ہیں، ان کے ہوتے ہوئے کسی نئے دین کی نہ ضرورت ہے، نہ گنجائش۔

یہود اور نصاریٰ یوں تو آپس میں ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے، آئے دن ان کے اندر مذہبی اختلاف کی بنا پر خون خچر ہوتا رہتا تھا، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کی مخالفت کے لیے دونوں آپس میں بڑے روادار بن گئے تھے۔ دونوں نے مل کر ایک متحدہ محاذ قائم کر لیا تھا اور ہم زبان ہو کر یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ جس کو نجات مطلوب ہو وہ یہودی بنے یا نصرانی۔ یہ نیا دین جو چلا ہے، یہ تو محض ایک فتنہ ہے۔

یہود نے اسلام کی مخالفت میں رواداری کی یہ روش مشرکین تک کے معاملہ میں اختیار کر لی تھی، نصاریٰ تو بہرحال ان کے اپنے ہی بھائی بند تھے۔ چنانچہ قرآن مجید میں ان کی اس حق دشمنی کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُؤْمِنُوْنَ بِالْجِبْتِ وَالطَّاغُوْتِ وَيَقُوْلُوْنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوْا هٰۤؤُلَاۤءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا۔ ۵۱۔ نساء (کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ ملا، وہ جبت اور طاغوت پر عقیدہ رکھتے ہیں اور کافروں کے متعلق یہ کہتے ہیں کہ یہ ایمان والوں سے زیادہ ہدایت پر ہیں)۔

اس پروپیگنڈے کو اس چیز سے تقویت پہنچی ہوگی کہ اہل عرب اہل کتاب سے پہلے سے حسن ظن رکھتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ اپنی تائید میں یہ بھی کہتے رہے ہوں گے کہ یہودیت اور نصرانیت کے آسمانی دین ہونے سے تو قرآن کو بھی انکار نہیں ہے۔ ان وجوہ سے قرآن نے اس کی بھی تفصیل کے ساتھ تردید کی فرمایا کہ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ، یہ ان کی باطل آرزوئیں ہیں۔ یعنی یہ محض ان کی من گھڑت باتیں ہیں جو بغیر کسی سند اور دلیل کے انھوں نے محض اپنے جی سے گھڑ رکھی ہیں۔ خدا نے یہودیت اور نصرانیت کسی کے حق میں بھی یہ پروانہ جاری نہیں کیا ہے کہ جو یہودی یا نصرانی بن گیا اس کے لیے جنت ہے۔ اگر وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں تو اپنے اس دعوے کی سچائی پر اپنی کتاب سے کوئی دلیل پیش کریں۔ اس طرح کی ان کی بہت سی تمنائیں اور خواہشیں تھیں جو انھوں نے دین اور عقیدہ بنا کر بلا کسی سند کے اپنے دلوں میں پال رکھی تھیں۔ قرآن نے اگرچہ یہاں ذکر ایک ہی کا کیا ہے لیکن جمع کا لفظ استعمال کر کے اشارہ ان سب کی طرف کر دیا ہے۔ ہم اسی

سورہ کی آیات (۸۰ - ۸۱) کی تفسیر کرتے ہوئے ان "امانی" کی تفصیل پیش کر چکے ہیں۔

بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗٓ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۱۱۲)

نجات کی اصلی راہ

یعنی نجات یافتہ اور مستحق جنت ہونے کے لیے یہودی یا نصرانی ہونا شرط نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ آدمی ایک تو مسلم بنے دوسرے یہ کہ محسن بنے۔ اسلام کے معنی یہ ہیں کہ آدمی اپنے آپ کو پورے طور پر خدا کے حوالہ کردے۔ اس کے نبیوں اور رسولوں میں کوئی تفریق کیے بغیر اپنی پوری زندگی کو اس کی شریعت کے تابع کردے۔ احسان کا مفہوم یہ ہے کہ شریعت کے احکام کی تعمیل پورے خلوص، پوری دیانت داری اور کامل راستبازی کے ساتھ کرے۔ جو لوگ اس طرح خدا کی بندگی اور اس کی اطاعت کا حق ادا کریں، ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے، ایسے لوگوں کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا، نہ کوئی غم، یہی تمام انبیاء اور تمام آسمانی صحیفوں کی تعلیم ہے اور یہی عقل اور فطرت کا تقاضا ہے۔

یہ پورا مضمون اسی سورہ کی آیات ۸۰، ۸۱ میں تفصیل کے ساتھ گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس کے مختلف پہلوؤں پر وضاحت کے ساتھ بحث کی ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُوْدُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُوْدُ عَلٰى شَيْءٍ وَّهُمْ يَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ (۱۱۳)

یہود و نصاریٰ کی باہمی جنگ و جدال

یعنی اسلام کی مخالفت کے لیے یہود اور نصاریٰ دونوں ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو گئے اور ایک دوسرے کو بڑی فیاضی کے ساتھ نجات یافتہ اور جنتی قرار دے رہے ہیں، لیکن اس پلیٹ فارم سے الگ ان کی باہمی تکفیر و تفسیق اور جنگ و جدل کا یہ حال ہے کہ یہود، نصاریٰ کی کوئی جڑ بنیاد تسلیم نہیں کرتے اور نصاریٰ، یہود کے لیے کوئی بنیاد تسلیم نہیں کرتے، حالانکہ دونوں ایک ہی کتاب کی پیروی کے مدعی ہیں، تورات دونوں میں مشترک ہے۔ اس سے واضح ہوا کہ آج جو ان کے اندر یہ گٹھ جوڑ ہو گیا ہے یہ نہ تو دین کے تحفظ کے لیے ہے نہ کسی اخلاص اور نیک نیتی پر مبنی ہے بلکہ محض اسلام دشمنی کا جذبہ ہے جس نے ان کو متحد کر دیا ہے۔

اَلَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (جو علم نہیں رکھتے) سے مراد مشرکین بنی اسماعیل ہیں، اس لیے کہ یہ کتاب و شریعت سے ناآشنا امی تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ انھوں نے بھی انھی لوگوں کی سی بات کہی۔ یعنی یہ بھی اپنے سوا سب کو باطل پر سمجھتے ہیں۔ لیکن اسلام کی مخالفت کے لیے آج یہ بھی اس مشترکہ محاذ میں شامل ہیں وہ ایک کتاب کے علم اور عمل کے مدعی ہوتے ہوئے دین کی یہ خدمت انجام دے رہے ہیں اور یہ بغیر کسی علم ہی کے پانچوں سواروں میں جا شامل ہوتے ہیں۔ "كَذٰلِكَ" اور "مِثْلَ قَوْلِهِمْ" کے الفاظ بظاہر دونوں ایک ہی مفہوم کے حامل نظر آتے ہیں لیکن غور کرنے سے دونوں سے یہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک سے

محرک اور جذبہ کا اشتراک ظاہر ہوتا ہے، دوسرے سے تعبیر کا۔ یعنی یہ بھی نیت اور عمل دونوں میں انہی یہود و نصاریٰ کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں۔

آخر میں بطور وعید کے فرمایا کہ ان کی اس نزاع کا فیصلہ اب آخرت میں خدا کی عدالت میں ہو گا۔ اس میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہ تسلی بھی ہے کہ تم اس نزاع میں صرف تبلیغ حق کے ذمہ دار ہو۔ اس سے زیادہ تمھارے اوپر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ یُّذْكَرَ فِیْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِیْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ یَّدْخُلُوْهَاۤ اِلَّا خَآئِفِیْنَ ؕ لَهُمْ فِی الدُّنْیَا خِزْیٌ وَّلَهُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (۱۱۴)

ایک دوسرے کے معابد کی تخریب

یہ اشارہ ہے ان مدعیانِ جنت کے ان کارناموں کی طرف جو انھوں نے باہمی عناد و عداوت کی بنا پر ایک دوسرے کے معابد کو تباہ و برباد کرنے کے سلسلہ میں انجام دیے۔ تاریخوں سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کے درمیان بیت المقدس میں بھی ایک دوسرے کو ذکر و عبادت سے روکنے کے لیے نہایت خونریز جنگیں ہو چکی ہیں اور باہر بھی جہاں جہاں اور جب جب ان میں سے کسی کو موقع ملا ہے اس نے مخالف فریق کے عبادت خانے برباد کرنے کی کوشش کی ہے۔ علاوہ ازیں تاریخ سے یہ بھی ثابت ہے کہ نصاریٰ نے لوگوں کو حج بیت اللہ سے روکنے کی سعی کی لیکن جب اس کوشش میں ان کو ناکامی ہوئی تو ابرہہ نے مکہ پر چڑھائی کر دی اور خانہ کعبہ کو منہدم کر دینے کا ارادہ کر لیا جس کی پاداش میں اس پر اور اس کی فوجوں پر اللہ تعالیٰ کا عذاب آیا۔

ان واقعات کی طرف اشارہ کرنے سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ جو لوگ آج اسلام کی مخالفت میں یوں ہم زبان ہو گئے ہیں ان کے باہمی تعصبات کا کیا حال رہا ہے، اور نجات و ہدایت کے ان ٹھیکیداروں کے کارنامے خدا کی مساجد کے معاملہ میں کتنے سیاہ ہیں۔ ساتھ ہی مساجدِ الٰہی کا مرتبہ و مقام واضح کرنے کے لیے فرمایا کہ دنیا میں سب سے زیادہ ظالم وہ مدعیانِ ہدایت و تقویٰ ہیں جو اللہ کی مسجدوں سے اللہ کا ذکر کرنے والوں کو روکیں اور ان مساجد کی بربادی کے درپے ہوں۔ جو گھر خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا ہے وہ خدا کا گھر ہے کسی کے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ خدا کے گھر میں اس کی تخریب کی جسارت کے ساتھ داخل ہو۔ اللہ کے گھر میں داخل ہونے کا واحد طریق یہ ہے کہ جو بھی اس میں داخل ہو ڈرتے ہوئے اور لرزتے ہوئے داخل ہو۔ جو لوگ اس کی خلاف ورزی کرتے ہیں ان کی نسبت فرمایا ہے کہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی اور آخرت میں عذاب عظیم ہے۔

مساجدِ الٰہی کے احترام کے اسی اصول کے تحت مسلمانوں کو یہود و نصاریٰ کے ساتھ جنگ کی حالت میں بھی ان کے گرجوں اور معابد کے ہدم یا ان کی توہین کی اجازت نہیں دی گئی۔ یہ مقام ان مسلمانوں کے لیے

خاص طور پر قابلِ غور ہے جو محض گروہی تعصبات کے تحت اپنے سے ذرا مختلف مسلک رکھنے والوں کو اپنی مساجد سے روکتے ہیں اور بعض اوقات دوسرے مسلک رکھنے والوں کی مساجد کی بے حرمتی کرنے کی جسارت بھی کر گزرتے ہیں۔

وجہ نزاع کی طرف اشارہ

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ (۱۱۵)

یہ اس وجہ نزاع و اختلاف کی طرف اشارہ ہے جو یہود و نصاریٰ کے درمیان معابد و مساجد کی توہین و تخریب کا سبب ہوتی۔ یہود و نصاریٰ دونوں کا قبلہ بیت المقدس تھا لیکن نصاریٰ نے خاص طور پر اس کی مشرقی سمت کو اپنے قبلہ کے لیے انتخاب کیا۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہوئی ہو کہ وہ حصہ جس میں حضرت مریم نے اعتکاف فرمایا تھا اسی سمت میں تھا۔ بیت المقدس کے اس عہد کے نقشہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا وہ حصہ جو خواتین کی عبادت کے لیے مخصوص تھا، اسی جانب تھا اور قرآن سے بھی کچھ ایسا ہی اشارہ نکلتا ہے۔ سورۂ مریم میں فرمایا ہے۔ وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا (۱۶) (اور کتاب میں مریم کی سرگزشت کو یاد کرو، جب کہ وہ اپنے لوگوں سے الگ ہو کر مشرقی جانب میں معتکف ہو بیٹھی) اس ضد میں یہود نے اس کی مغربی سمت کو اختیار کیا ہوگا اور پھر اندرون بیت المقدس کی یہ تقسیم اس سے باہر نکل کر مستقلاً مشرق و مغرب کی تقسیم بن گئی ہوگی۔ یعنی نصاریٰ نے سمت مشرق کو اپنا قبلہ بنا لیا اور یہود نے مغرب کو۔ پھر اس مشرق و مغرب کے اختلاف نے دونوں کو خوب خوب لڑایا۔ بیت المقدس کے اندر بھی اور اس سے باہر بھی۔ اور اس کے نتیجہ میں دونوں فریق نے ایک دوسرے کے معابد کی پوری بے دردی کے ساتھ بے حرمتی کی۔

قرآن مجید نے یہاں اس سبب اختلاف و نزاع کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس کی لغویت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ مشرق ہو یا مغرب، دونوں سمتیں اللہ ہی کی ہیں۔ ان میں سے جس سمت کو بھی انسان رخ کرے اگر وہ خدا کی طرف متوجہ ہے تو اس کا رخ خدا ہی کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس چیز کو یہود و نصاریٰ نے سر پھٹول اور ہدم معابد و مساجد کا سبب بنایا تو یہ ان کی جہالت و حماقت ہے۔ سمتوں اور جہتوں میں سے کسی سمت و جہت کو بھی خدا کے ساتھ اختصاص نہیں ہے۔ وہ بیت المقدس کو قبلہ قرار دے کر جدھر بھی رخ کرتے، خدا ہی کی طرف رخ کرتے۔ خدا کی قدرت اور اس کے علم کی وسعت ہر چیز کو محیط ہے۔

ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد

یہ بحث مزید تفصیل کے ساتھ آگے تحویل قبلہ کی آیات کے تحت آ رہی ہے۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ بَلْ لَّهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ (۱۱۶)

'ولد' کا مفہوم

وَلَد کے معنی اولاد کے ہیں۔ یہ لفظ واحد، جمع، مذکر، مؤنث سب کے لیے آتا ہے۔

فساد عقیدہ

اوپر اسلام کے خلاف محاذ قائم کرنے والوں کے ان کارناموں کا حوالہ دیا تھا جو انھوں نے خدا کی مساجد کی تخریب کے سلسلہ میں انجام دیے ہیں، اب یہ ایک اشارہ ان کے مشرکانہ عقائد کی طرف بھی فرما دیا تاکہ ہدایت اور

نجات کی اجارہ داری کے ان مدعیوں کا یہ پہلو بھی سامنے آجائے کہ عقیدہ کے اعتبار سے یہ کس سطح پر ہیں۔ اس سلسلہ میں فرمایا کہ یہ لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ خدا کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ یہود عزیز کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، نصاریٰ مسیح کو اور مشرکین عرب فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیتے تھے۔ ان سب کی تردید کرتے ہوئے فرمایا کہ سُبْحٰنَہٗ خدا اس طرح کی تمام نسبتوں سے پاک اور ارفع ہے۔ کوئی چیز کسی پہلو سے بھی اس کی ذات یا صفات یا اس کے حقوق میں شریک و سہیم نہیں ہے۔ بلکہ آسمان و زمین کی ساری چیزیں اس کی مخلوق و مملوک ہیں۔ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ اس کی بندگی اور اطاعت کے علاوہ سے آزاد ہو بلکہ سب اسی کے تابع فرمان ہیں۔

بَدِیْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ ﴿۱۱۷﴾

'بدیع' کی تحقیق

بَدَعَ کے معنی کسی شے کو عدم سے وجود میں لانے اور بغیر کسی مادہ و مثال کے ایجاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے بدعت کا لفظ ہے جس کے معنی ہیں دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کرنا جس کے لیے کوئی مثال، نظیر اور کوئی ماخذ و مصدر نہ ہو۔ بدیع اسی سے فعیل کا وزن ہے اور معنی میں فاعل کے ہے۔

تنزیہہ باری تعالیٰ کی مزید وضاحت

اوپر والی آیت کے مضمون تنزیہ باری کی یہ مزید وضاحت ہے کہ یہ بیٹے بیٹیاں جو خدا کے لیے فرض کیے گئے ہیں اس واہمہ کی بنیاد پر فرض کیے گئے ہیں کہ جس طرح دوسرے اپنے معاملات کے انتظام و انصرام میں معاونین اور شرکاء کے محتاج ہوتے ہیں اسی طرح خدا بھی شرکاء اور معاونین کا محتاج ہے۔ حالانکہ خدا اس قسم کے شرکاء اور معاونین سے بالکل بے نیاز و مستغنی ہے۔ وہ آسمان و زمین کو تنہا اپنی قدرت و حکمت سے وجود میں لایا اور جب کسی امر کا فیصلہ کرتا ہے تو بس فرما دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتی ہے۔ ایسی بے نیاز و مستغنی اور ایسی بے ہمہ و باہمہ قادر مطلق ذات کے ساتھ آل و اولاد کا کیا جوڑ ہے!

وَقَالَ الَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ لَوْلَا یُکَلِّمُنَا اللّٰہُ اَوْ تَاْتِیْنَاۤ اٰیَۃٌ ؕ کَذٰلِکَ قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِہِمْ مِّثْلَ قَوْلِہِمْ ؕ تَشَابَہَتْ قُلُوْبُہُمْ ؕ قَدْ بَیَّنَّا الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰکَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا ۙ وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ ﴿۱۱۹﴾

مشرکین کے بعض مطالبات کا جواب

اَلَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ، سے، جیسا کہ آیت ۱۱۳ کے تحت وضاحت ہو چکی ہے، مشرکین بنی اسماعیل مراد ہیں۔ اوپر اہل کتاب کے اعتراضات اور ان کی وسوسہ اندازیوں کا ذکر فرمایا تھا۔ اب اسی متحدہ محاذ مخالفت کے تیسرے رکن یعنی مشرکین کے بعض مطالبات کا ذکر کر کے ان کا جواب دیا ہے۔

ان کا پہلا مطالبہ یہ تھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ خدا ان سے ہم کلام ہوتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو خدا نے انھی کو ہمارے اندر سے ہم کلامی کے لیے کیوں منتخب کیا، آخر ہم جو قریش کے سردار اور لیڈر ہیں اور اثر و اقتدار میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے کہیں اونچے ہیں، خدا ہم سے ہم کلام کیوں نہیں ہوتا؟ اس مطالبہ کا جواب قرآن نے بعض جگہ دیا ہے۔ مثلاً ایک جگہ فرمایا ہے کہ کسی انسان کی یہ شان نہیں ہے کہ اللہ اس سے براہِ راست کلام کرے، وہ صرف وحی کے ذریعہ سے یا پردہ کی آڑ سے بات کرتا ہے۔ پھر وحی اور رسالت سے

متعلق یہ وضاحت فرمادی ہے کہ ہر کس و ناکس اس منصب کا اہل نہیں ہوا کرتا، یہ صرف اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے کہ کون اس منصب عظیم کے لیے اہل ہے۔ لیکن یہاں خاص اس مطالبہ کا جواب نہیں دیا ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا جواب نہ دینے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ مطالبہ اس قدر گستاخانہ اور احمقانہ ہے کہ اس کا جواب نہ دینا ہی اس کا جواب ہے۔ غور کیجیے کہ قرآن کی اس موقع پر اس خاموشی نے سرداران قریش کے پندارِ سیادت پر کیسی کاری ضرب لگائی ہوگی۔

دوسرا مطالبہ یہ تھا کہ ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ نشانی سے ان کی مراد کوئی ایسی نشانی تھی جو ایک محسوس معجزہ کی نوعیت کی ہو جس کو دیکھ کر ہر شخص پکار اٹھے کہ بے شک اس نشانی کا دکھانے والا خدا کا فرستادہ اور اس کا رسول ہے۔ مثلاً یہ کہ اس رسول کے ساتھ ساتھ کوئی فرشتہ اس کی رسالت کی منادی کرتا پھرے، یا اس کے حکم سے مُردے جی اٹھیں، یا اس کے اشارے سے پہاڑ چلنے لگیں یا اس کی خواہش پر صحرا چمن بن جائے یا اور نہیں تو کم از کم اس کے ایما پر اس عذاب ہی کا کوئی نمونہ نمودار ہو جائے جس کی یہ پیر روز دھمکی سنا رہے ہیں۔

اس مطالبہ کے جواب میں پہلی بات تو یہ فرمائی کہ جس طرح کی نشانی کے لیے یہ مطالبہ کر رہے ہیں بالکل اسی طرح کی نشانی کے لیے ان قوموں نے اپنے اپنے رسولوں سے مطالبے کیے جو ان سے پہلے گزر چکی ہیں۔ انھوں نے بھی حق واضح ہو چکنے کے بعد محض رسول کو زچ کرنے کے لیے اس طرح کی نشانی کے لیے مطالبے کیے اور یہ بھی حق کو سمجھ چکنے کے باوجود محض زچ کرنے کی خواہش کے تحت یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ پھر فرمایا کہ ان کے دل بھی بالکل انھی لوگوں کے دلوں کی مانند ہو گئے ہیں۔ یعنی قساوت، طغیانی اور حق دشمنی کی جو سیاہی ان کے دلوں پر بھی چھا رہی ہے۔ پھر لازماً اس کے نتیجہ میں ان پر بھی خدا کی طرف سے اسی طرح کا کوئی عذاب آئے گا جس طرح کے عذاب ان پر آئے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ جہاں تک تمھاری رسالت اور تمھاری دعوت کے حق ہونے کا تعلق ہے اس کے دلائل آفاق سے، انفس سے، آسمان سے، زمین سے، تاریخ سے، آثار سے، ہر پہلو سے ہم نے کھول کھول کر قرآن میں بیان کر دیے ہیں۔ یہ دلائل اس قدر واضح ہیں کہ ان کے بعد کسی نشانی اور معجزہ کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن یہ دلائل ان لوگوں کے لیے مفید ہیں جو یقین کرنا چاہیں، جو یقین نہیں کرنا چاہتے ان کو دنیا کی کوئی چیز بھی قائل نہیں کر سکتی، ایسے لوگ تو عذاب دیکھ کر بھی ایمان نہیں لاتے، یہاں تک کہ وہ عذاب ان کی کمر توڑ کر رکھ دیتا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی کہ اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ بِالْحَقِّ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلَا تُسْـَٔلُ عَنْ اَصْحٰبِ الْجَحِیْمِ۔ ہم نے تم کو حق دے کر اس لیے بھیجا ہے کہ تم اس کے قبول کرنے والوں کو نجات و فلاح کی خوش خبری سنا دو اور اس کی تکذیب کرنے والوں کو اس تکذیب کے انجام بد سے ڈراؤ۔ اس انذار و تبشیر

کا فرض انجام دے چکنے کے بعد تمھاری ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ ان کے مطالبوں کی تعمیل میں ان کی خواہشات کے مطابق نشانیاں اور معجزے دکھانا تمھاری ذمہ داری نہیں ہے۔ تم سے جو پرسش ہوگی تمھارے فرض رسالت کی ادائیگی کے بارے میں ہوگی، اس بارے میں ہرگز نہیں ہوگی کہ یہ جہنم میں جانے والے لوگ جہنم میں کیوں گئے ایمان کیوں نہیں لائے۔

یہ ساری باتیں جو اوپر عرض کی گئی ہیں مکی سورتوں میں پچھلی قوموں کی سرگزشتوں کے ضمن میں مختلف اسلوبوں سے بیان ہوں گی اس وجہ سے ہم یہاں ان کی زیادہ تفصیل نہیں کرتے۔

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۭ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۭ وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَاۗءَھُمْ بَعْدَ الَّذِيْ جَاۗءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ (۱۲۰)

یہود و نصاریٰ کی اصلی بیماری

مشرکین کے رویہ سے مایوس کر دینے کے بعد یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہود و نصاریٰ کا رویہ واضح کیا گیا ہے کہ یہ بھی تم سے اس وقت تک راضی ہونے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کی ملت کے پیرو نہ بن جاؤ۔ یعنی یہودیت یا نصرانیت نہ اختیار کر لو۔ اس لیے کہ ان کے سامنے سوال صرف حق کی وضاحت اور دلائل کے ظہور کا نہیں ہے بلکہ اپنے اپنے طریقہ پر جمود کا ہے۔ وہ حق سے زیادہ اپنی خواہشات کے پرستار ہیں اور تمھارے لیے خدا کی طرف سے "العلم" یعنی علم وحی کے آجانے کے بعد ان کی خواہشات و بدعات کی پیروی کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہتا۔ اس وجہ سے ان کو یہ فیصلہ کن جواب دے دو کہ اصل ہدایت تو وہ ہے جو اللہ کی طرف سے آئے تو اب جب کہ میرے پاس اللہ کی ہدایت آچکی ہے میں اس کو چھوڑ کر کسی اور طریقہ کی پیروی کس طرح کر سکتا ہوں۔ یہاں یہود و نصاریٰ کے اختیار کیے ہوئے طریقوں کو اہواء (خواہشات) کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کی طرف سے ہدایت آجانے کے بعد کسی اور طریقہ پر جمے رہ جانا درحقیقت اپنی خواہشات کی پیروی ہے۔

وَلَىِٕنِ اتَّبَعْتَ، میں خطاب اگرچہ بظاہر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے لیکن اس میں جو تنبیہ اور عتاب ہے اس کا رخ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔ اس طرز خطاب کی مثالیں قرآن مجید میں بہت ملیں گی۔

اس آیت میں ملت کا جو لفظ آیا ہے اس کے اصل معنی طریقہ کے ہیں لیکن اس سے کسی شخص یا گروہ کا وہ طریقۂ زندگی مراد ہوتا ہے جس کی بنیاد مذہب اور روایات مذہب پر ہو۔

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰھُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ۭ اُولٰۗىِٕكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ ھُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۱۲۱)

صالحین اہل کتاب کا ذکر

عام اہل کتاب کے رویہ سے مایوسی کے اظہار کے بعد ان اہل کتاب کا ذکر فرمایا جو اپنی کتاب پر فی الواقع ایمان رکھتے تھے۔ ان کے متعلق فرمایا کہ یہ لوگ اس ہدایت الٰہی پر ایمان لائیں گے جو تم ان کے سامنے پیش کر رہے ہو۔

یہاں صالحین اہل کتاب مراد لینے کی ہمارے نزدیک کئی وجہیں ہیں۔

ایک تو یہ ہے کہ ان کے متعلق فرمایا ہے یَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ (یہ اس کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کی تلاوت کا حق ہے) ہمارے نزدیک یہ ضمیر مفعول سے حال پڑا ہوا ہے اور مقصود اس سے یہ ظاہر کرنا ہے کہ ان کا حال شروع سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی سچی قدر کی ہے جو ان کو ملی تھی۔ ان لوگوں کے مانند یہ کبھی نہیں رہے ہیں جن کا حال قرآن نے یہ بیان کیا ہے، کہ کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا۔ چارپائے برو کتابے چند۔ پیٹھ پر کتابوں کا بوجھ تو ہے لیکن کچھ خبر نہیں کہ ان کتابوں میں کیا ہے۔ بلکہ یہ فکر و تدبر کے ساتھ برابر اس کی تلاوت کرتے رہے ہیں اور ان کی یہ تلاوت طلب ہدایت کے لیے تھی نہ کہ محض اپنی من گھڑت آرزوں اور خواہشات کے حق میں دلائل ایجاد کرنے کے لیے۔

دوسری یہ کہ ان کے متعلق خبر دی ہے کہ یہ اس ہدایت پر ایمان لائیں گے جو آخری رسول کے ذریعہ سے اللہ نے ان پر اتاری ہے۔

تیسری یہ کہ یہاں ان اہل کتاب کے لیے اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کا صیغہ استعمال کیا ہے۔ قرآن کے نظائر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ صیغہ اہل کتاب کے لیے بالعموم مدح کے موقع میں استعمال ہوا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا یَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (۱۴۶۔ بقرہ)	اور جن کو ہم نے کتاب بخشی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو پہچانتے ہیں۔
۲۔ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَعْلَمُوْنَ اَنَّهٗ مُنَزَّلٌ مِّنْ رَّبِّكَ بِالْحَقِّ۔ (۱۱۴۔ انعام)	اور جن کو ہم نے کتاب عنایت کی ہے وہ جانتے ہیں کہ یہ قرآن تمھارے رب کی طرف سے حق لے کر اترا ہے۔
۳۔ وَالَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ یَفْرَحُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ (۳۶۔ رعد)	اور جن کو ہم نے کتاب عطا کی ہے وہ خوش ہوتے ہیں اس چیز سے جو تمھاری طرف اتاری گئی ہے۔
۴۔ اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِهٖ هُمْ بِهٖ یُؤْمِنُوْنَ (۵۲۔ قصص)	اور جن کو ہم نے کتاب دے رکھی ہے اس کے پہلے سے وہ اس پر ایمان لائیں گے۔

اَلَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ کے مقابل میں اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰهُمُ الْكِتٰبَ کے الفاظ کے اندر اہتمام اور عنایت کا جو پہلو نمایاں ہے وہ ان لوگوں سے مخفی نہیں ہو سکتا جو معروف اور مجہول کے مواقع استعمال اور عربی زبان میں ان دونوں اسلوبوں کی ادبی نزاکتوں سے واقف ہیں۔ مذکورہ اسلوب میں معروف کا صیغہ اس حقیقت کو ظاہر کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حقیقت میں انھی کو دی جنھوں نے اس کی قدر کی، جنھوں نے اس کی قدر نہیں کی

ان کو گویا خدا نے کتاب دی ہی نہیں۔ اسی فرق کے سبب سے اُوْتُوا الْکِتٰبَ کا صیغہ مدح کے مواقع میں بہت کم استعمال ہوا ہے۔ اُولٰٓئِکَ یُؤْمِنُوْنَ بِہٖ، خبر ہے اَلَّذِیْنَ اٰتَیْنٰھُمُ الْکِتٰبَ یَتْلُوْنَہٗ حَقَّ تِلَاوَتِہٖ کی۔ یعنی جو اہل کتاب اپنی کتاب کا حق صحیح طریقہ پر ادا کرتے رہے ہیں وہی اس ہدی اللہ پر ایمان لائیں گے جو پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) ان کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سنت اللہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی روحانی نعمتوں میں برکت انھی کو عطا فرماتا ہے جو ان کی قدر کرتے ہیں، جو قدر نہیں کرتے ان کو مزید عطا ہونا تو الگ رہا جو عطا ہوئی ہوتی ہے وہ بھی ان سے سلب کر لی جاتی ہیں۔ آخری شریعت کے بارے میں یہی وعدہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ اس میں تمھاری ذریت کے صرف اچھے ہی لوگ حصہ پائیں گے، جو بُرے ہوں گے وہ اس سے محروم رہیں گے۔ پھر یہی بات اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر واضح فرمائی تھی کہ جو تقویٰ پر قائم رہیں گے وہی آخری نبی پر ایمان لائیں گے۔ اسی حقیقت کو مختلف اسلوبوں سے حضرت مسیح نے واضح فرمایا۔ تفصیل ان چیزوں کی اپنے مقام پر آئے گی۔

۴۶۔ نسخ کی حقیقت اور اس کی ضرورت

اس مجموعۂ آیات کی تمام اہم تعلیمات کی طرف ہم آیات کی وضاحت کے ضمن میں اشارہ کرتے آئے ہیں، غور سے مطالعہ کرنے والوں کے لیے وہ کافی ہے، البتہ نسخ کا مسئلہ جو آیت ۱۰۶ میں بیان ہوا ہے وہ مزید وضاحت کا محتاج ہے۔ ہم اس کے بعض اہم پہلوؤں پر یہاں روشنی ڈالیں گے اور اس سلسلہ میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کے فکر سے بھی استفادہ کریں گے۔

اوپر نسخ سے متعلق جو آیت گزری ہے، اس پر ایک نظر پھر ڈال لیجیے۔ فرمایا ہے مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْ نُنْسِھَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْ مِثْلِھَا (جو آیت (حکم) بھی ہم منسوخ کرتے ہیں یا اس کو نظر انداز کراتے ہیں اس سے بہتر یا اس کے مانند دوسری لاتے ہیں) سیاق و سباق اور نظم کلام کی روشنی میں ہم نے اس آیت کا تعلق صرف ادیانِ سابقہ سے مانا ہے۔ اہل کتاب نے یہ اعتراض جو اٹھایا تھا کہ قرآن جب ہماری کتابوں کو آسمانی تسلیم کرتا ہے تو ان کی تعلیمات کو منسوخ کیوں کرتا ہے، قرآن نے یہ ان کے اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ اب آئیے اس جواب کی نوعیت پر غور کیجیے اور دیکھیے کہ یہ ہر پہلو سے معقول اور اطمینان بخش ہے یا نہیں۔ آیت پر تدبر کرنے سے جواب کے دو پہلو واضح طور پر سامنے آتے ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ یہ نسخ خوب سے خوب تر کی طرف عروج اور ترقی کے نقطۂ نظر سے ہے۔ بالفاظ دیگر یہ اللہ تعالیٰ کے اس وعدے کی تکمیل ہے جو اس نے حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ سے فرمایا تھا کہ وہ اپنا آخری نبی بھیجے گا جو اللہ کی شریعت کو کامل کرے گا، تمام طیبات کو حلال کرے گا، تمام خبائث کو حرام ٹھہرائے گا اور لوگوں کو ان بہت سی پابندیوں سے آزاد کرے گا، جو اس وقت ان پر ہیں۔

اس حقیقت کو واضح طور پر ذہن نشین کرنے کے لیے مندرجہ ذیل امور پیشِ نظر رکھیے۔

الف۔ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی شریعت درجہ بدرجہ ترقی کرتی ہوئی اس نقطۂ کمال تک پہنچی ہے جس نقطۂ کمال پر وہ قرآن حکیم میں نظر آتی ہے۔ اس تدریجی ترقی کے لیے جو چیز متقضی ہوئی ہے وہ انسان کی فطرت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ تدریجی تربیت ہی کے ذریعہ سے اس مقام تک پہنچ سکتا تھا جس مقام پر پہنچ کر وہ خدا کے دینِ کامل کا اہل بن سکا ہے۔ اس مقام پر پہنچنے سے پہلے تک اس کو جو دین ملا وہ بنیادی طور پر تھا تو اسلام ہی لیکن اپنی ظاہری شکل و صورت یا با لفاظ دیگر اپنی شریعت کے اعتبار سے بہت کچھ انھی سانچوں پر ڈھلا ہوا تھا جو سانچے اس عہد کے ذہنی، عقلی اور اجتماعی و تمدنی تقاضوں سے مناسبت رکھتے تھے۔ تدریجی تربیت کے ذریعہ سے جب اس کی فطرت کے تمام مضمرات واضح ہو گئے اور اس کی عقل بلوغ کو پہنچ گئی، محسوسات و رسوم کی قیدوں اور قومی و قبائلی تنگنایوں سے آزاد ہو کر اس نے سوچنا سمجھنا شروع کیا تب اللہ تعالیٰ نے اس کو اسلام اس شکل و صورت اور اس شریعت کے لباس میں دیا جو ٹھیک ٹھیک اس کی فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہے، کوئی چیز نہ اس سے کم ہے نہ اس سے زیادہ۔ یہ ترقی اس امر کی متقضی ہوئی کہ پچھلی شریعتوں کی بہت سی چیزیں بدلیں اور اسلام میں وہ اپنی ان شکلوں میں نمودار ہوں جو ان کی بالکل معیاری اور فطری شکلیں ہیں۔

ب:۔ تورات کے بہت سے احکام کی ظاہری شکل بھی اس بات کی گواہی دیتی ہے کہ یہ جس وقت نازل ہوئے تھے خام حالت میں تھے، ان کو پختہ ہونے کے لیے کسی اور فصل و موسم کا انتظار تھا۔ اسلام کے ظہور نے ان کے لیے وہ منتظر موسم فراہم کیا اور وہ پختگی کو پہنچے۔ مثلاً شراب ان کے ہاں صرف عبادت خانہ کے ذمہ داروں کے لیے حرام تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک اشارہ تھا اس بات کی طرف کہ یہ چیز تقویٰ و طہارت کے منافی ہے اور ایک دن آئے گا کہ یہ سب کے لیے حرام ہو کر رہے گی۔ چنانچہ اسلام نے اس کی حرمت کے سلسلہ میں پہلا قدم اسی مقام سے اٹھایا کہ نماز کے اوقات میں اس کو حرام ٹھہرایا۔ پھر بتدریج اس کو بالکل حرام کر دیا۔ روایات بلکہ قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے اندر جو لوگ زیادہ ذہین اور روحِ دین کے ذوق آشنا تھے وہ پہلا ہی حکم سن کر ہوا کا رخ پہچان گئے اور اسی وقت سے وہ شراب سے بالکل تائب ہو گئے۔ اسی طرح کھانے پینے کی دوسری چیزوں کی حلت و حرمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض چیزیں یا تو بنی اسرائیل کے خاص قومی ذوق کے تحت ان کے لیے حرام ٹھہرائی گئیں، یا ان کے بے جا قسم کے سوالات کی سزا کے طور پر، مثلاً اونٹ یا ذبیحہ کے بعض حصوں کی چربی۔ یہ حرمتیں اپنی ہیئت ہی سے ظاہر کر رہی تھیں کہ یہ عارضی اور وقتی ہیں، ایک دن آئے گا کہ اس قسم کی تمام پابندیاں فطرت انسانی کے منافی ہونے کے سبب سے اٹھ جائیں گی۔ چنانچہ دینِ فطرت نے اَلْيَوْمَ اُحِلَّ لَكُمُ الطَّيِّبٰتُ (اب تمھارے لیے تمام پاکیزہ چیزیں حلال کر دی گئیں) کا عام اعلان کر کے اس قسم کی تمام پابندیوں کو منسوخ کر دیا۔ تورات سے اس قسم کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی

ہیں، لیکن مقصود یہاں تفصیل نہیں بلکہ ایک حقیقت کی طرف صرف اشارہ ہے۔

ج ۔ تکمیل و ترقی کی اس ضرورت کی طرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں اشارہ بھی فرمایا تھا۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ :۔

"خداوند تیرا خدا تیرے ہی درمیان سے یعنی تیرے ہی بھائیوں میں سے میری مانند ایک نبی برپا کرے گا تم اس کی سننا۔ یہ تیری اس درخواست کے مطابق ہوگا جو تو نے خداوند اپنے خدا سے مجمع کے دن حورب میں کی تھی کہ مجھ کو نہ تو اپنے خداوند اپنے خدا کی آواز پھر سننی پڑے اور نہ ایسی بڑی آگ ہی کا نظارہ ہو تاکہ میں مر نہ جاؤں اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں۔ میں ان کے لیے انھی کے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی وہ ان سے کہے گا۔ اور جو کوئی میری ان باتوں کو جن کو وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سنے تو میں ان کا حساب اس سے لوں گا۔ (تثنیہ ۱۸: ۱۵-۲۰)

ان آیات میں جہاں ایک طرف نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا صریح الفاظ میں وعدہ ہے وہیں اس بات کی طرف اشارہ بھی ہے کہ دین کی تکمیل آپ ہی کے ذریعہ سے ہوگی، حورب کے مقام میں بنی اسرائیل نے خود اس امر کا اظہار کر دیا تھا کہ وہ اب مزید شریعت کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اپنے اندر نہیں پا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اس اعتراف ضعف کی تحسین فرمائی اور وعدہ فرمایا کہ وہ ان کے بھائیوں میں سے حضرت موسیٰؑ کی مانند ایک دوسرا نبی برپا کرے گا اور اس کے ذریعہ سے اپنے دین کی تکمیل فرمائے گا۔

اس سے زیادہ واضح الفاظ میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس حقیقت کو ظاہر فرمایا۔ ملاحظہ ہو :۔

مگر اب میں اپنے بھیجنے والے کے پاس جاتا ہوں اور تم میں سے کوئی مجھ سے نہیں پوچھتا کہ تو کہاں جاتا ہے بلکہ اس لیے کہ میں نے تم سے یہ باتیں کہیں تمہارا دل غم سے بھر گیا۔ لیکن میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے۔ کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا۔ لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔ گناہ کے بارے میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ راستبازی کے بارے میں اس لیے کہ میں باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ عدالت کے بارے میں اس لیے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔ مجھے تم سے اور بھی بہت سی باتیں کہنا ہے مگر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ یعنی سچائی کا روح آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا، اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔ (یوحنا ۱۶: ۵-۱۴)

ان آیات میں "مددگار" اور "سچائی کا روح" یا بعض دوسرے ترجموں میں "معزی" اور "وکیل" کے الفاظ جو وارد ہوئے ہیں، ان کا مصداق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کون ہو سکتا ہے؟ حضورؐ ہی کے اوپر یہ بات منطبق

ہو سکتی ہے کہ "وہ تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا" اور حضور ہی کی یہ شان ہو سکتی ہے کہ "وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا"۔ بعینہٖ یہی بات قرآن مجید میں ان الفاظ میں وارد ہوتی ہے کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى (وہ یہ اپنے جی سے نہیں کہتا بلکہ یہ وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے) اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ پیشین گوئی فرمائی کہ نبی موعود وہی کچھ کہے گا جو خداوند خدا اس کے منہ میں ڈالے گا اور جو خبر وہ دے گا اس میں وہ سچا ٹھہرے گا۔

تورات اور انجیل کی انہی پیشین گوئیوں کی طرف سورہ اعراف کی مندرجہ ذیل آیتوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔

قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَآءُ ۚ وَرَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِيَّ الْاُمِّيَّ الَّذِيْ يَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِيْلِ ۡ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَـبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۭ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ ۙ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (۱۵۵-۱۵۶)	فرمایا کہ رہا میرا عذاب تو میں اس کو نازل کرتا ہوں جس پر چاہتا ہوں اور میری رحمت تو ہر چیز پر محیط ہے سو میں اس کو لکھ رکھوں گا ان لوگوں کے لیے جو مجھ سے ڈرتے رہیں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے، یعنی جو پیروی کریں گے اس رسول اور نبی امی کی جس کو لکھا ہوا پاتے ہیں اپنے ہاں تورات اور انجیل میں، وہ ان کو حکم دیتا ہے نیکی کا اور روکتا ہے برائی سے اور ان کے لیے جائز کرتا ہے تمام پاکیزہ چیزوں کو اور حرام ٹھہراتا ہے ناپاک چیزوں کو، اور ان سے دور کرتا ہے ان کے بوجھ اور ان پابندیوں کو جو ان پر پہلے سے تھیں، پس جو ایمان لائے اس پر اور جنھوں نے اس کی تائید اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس کے ساتھ اتاری گئی، وہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔

نسخ بغرضِ تجدیدِ دین

۲۔ جواب کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ نسخ تجدید واحیائے دین کے تقاضے کے تحت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو شریعت ملی تھی اس کے کچھ حصہ کو، جیسا کہ قرآن مجید میں تصریح ہے، انھوں نے فراموش کر دیا تھا۔ اس فراموش کردہ حصہ میں سے جس چیز کو اللہ تعالیٰ نے ضروری ٹھہرایا اس دینِ کامل کے ذریعہ سے اس کی تجدید فرما دی تاکہ دین کے خزانہ سے جو دولت پاسبانوں کی غفلت اور نالائقی سے ضائع ہو گئی تھی، وہ از سرِ نو محفوظ ہو جائے اور اگر اس کے کسی حصہ کو حکمتِ الٰہی نے ضروری نہیں ٹھہرایا۔ بلکہ الٰہی کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ اس حصہ کو نظر انداز کر دیا جائے، تو اس کی جگہ اس کے ہم پایہ و ہم مرتبہ دوسر

احکام عنایت فرمائے۔

یہاں اِنْسَاءٌ کا جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ فراموش کرا دینے کے معنی میں ہے۔ آیت زیر بحث میں اللہ تعالیٰ نے اس فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ یہ نسبت اسی طرح کی ہے جس طرح قرآن مجید میں دوسری جگہ فرمایا ہے فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ (جب وہ کج ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان کے دل کج کر دیے) یہ اسلوب بیان اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ یہ معاملہ اپنے قانون حکمت کے مطابق کیا اور اس لیے کیا کہ وہ اپنی شریعت کے معاملہ میں اپنی بے پروائی کے سبب سے اسی چیز کے مستحق تھے۔ لیکن چونکہ شریعت الٰہی تمام انسانیت کا مشترک سرمایہ ہے، اس وجہ سے جس طرح اس کے وقتی احکام کی اسلام کے دائمی اور اعلیٰ احکام کے ذریعہ سے تکمیل کی گئی، اسی طرح اس کے فراموش کردہ اور ضائع شدہ احکام کی ان کے مماثل احکام کے ذریعہ سے قرآن میں تجدید کی گئی۔

تطہیر شریعت

۳۔ نسخ کی یہ ضرورت تکمیل دین اور تجدید شریعت کے پہلو سے بیان ہوئی اور یہ ایسی واضح ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں تھی، لیکن قرآن مجید نے نسخ کے صرف انھی دو پہلوؤں کے بیان پر اکتفا نہیں فرمایا ہے، بلکہ ایک تیسرے پہلو سے بھی اس کی ضرورت بیان فرمائی ہے۔ یہ پہلو دین و شریعت کی تطہیر کا پہلو ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی کتاب اور اس کی شریعت کو ان بدعتوں اور ملاوٹوں سے پاک کرنا جو اہل بدعت اور خواہش پرستوں نے ان میں ملا دی ہوں۔ اس کا ذکر سورہ حج کی اس آیت میں ہوا ہے جس کا حوالہ ہم اوپر دے آئے ہیں۔ فرمایا ہے فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (پس اللہ مٹا دیتا ہے اس چیز کو جو شیطان داخل کر دیتا ہے، پھر اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے)

اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ نسخ رد بدعات اور ابطال باطل کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اشرار و مفسدین نے آسمانی صحیفوں اور الٰہی شریعتوں میں جو بدعتیں اور من گھڑت چیزیں ملائیں، انبیاء علیہم السلام نے ان سے دین کو پاک و صاف کیا اور اس کی اصل تعلیمات کو از سر نو زندہ کر کے ان کو قائم کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء علیہم السلام تشریف لائے ان کی اکثریت انھی انبیا پر مشتمل تھی جو کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بلکہ ان میں سے بیشتر کا مشن صرف یہی تھا کہ وہ پہلے سے نازل شدہ شریعت کو بدعتوں اور تحریفات سے پاک کر کے اس کو اس کی اصلی حالت پر لوٹا دیں۔ اس امت میں یہ خدمت اللہ و رسول کی طرف سے علما کے سپرد کی گئی ہے کہ وہ برابر دین کو بدعات و تحریفات سے پاک کرتے اور امت کو کتاب و سنت کی طرف لوٹاتے رہیں۔

پچھلی شریعتوں میں اس قسم کے جو اضافے کیے گئے اور اسلام نے جن کو منسوخ کر کے ان کی اصل حقیقت پیش کی، یہاں ہم ان کی چند مثالیں ذکر کرتے ہیں تاکہ اس پہلو سے نسخ کی جو ضرورت و اہمیت ہے وہ اچھی طرح واضح ہو کر سامنے آ جائے۔

عقائد و ایمانیات کے باب میں یہود اور نصاریٰ نے جس قسم کی لغویات کا اضافہ کیا اور قرآن نے جس کی اصلاح کی ان میں سے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ خدا تین کا تیسرا ہے یا مثلاً یہ کہ یہود اللہ کے بیٹے اور اس کے چہیتے ہیں، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ کو آسمان وزمین کے پیدا کرنے سے تکان ہو گئی اس وجہ سے اس نے ہفتہ کے دن آرام فرمایا، یا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان سے اس بات کا اقرار لے رکھا ہے کہ جب تک کوئی نبی وہ قربانی پیش نہ کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اترے اس وقت تک وہ اس پر ایمان نہ لائیں یا یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں برص کی بیماری تھی۔ قرآن مجید نے اس قسم کی تمام باتوں کی تردید کر کے اصل حقائق واضح فرمائے۔

اسی طرح یہود نے اپنی بدکارانہ زندگی کو جائز ٹھہرانے کے لیے اکثر انبیا علیہم السلام سے متعلق نہایت بے ہودہ قسم کی روایات اپنے صحیفوں میں شامل کر دیں جو ان کے اخلاق کو بالکل مجروح کر دینے والی تھیں۔ قرآن مجید نے ان انبیاء کو اس قسم کے تمام اتہامات سے بری کر کے ان کی زندگیوں کو ان کے اصلی رنگ میں پیش کیا۔

اعمال کے باب میں ان لوگوں نے جس قسم کی بدعتیں کیں ان کی بعض مثالیں اس سورہ میں گزر چکی ہیں اور بعض کا ذکر آگے آ رہا ہے۔ مثلاً ان کا وہ رویہ جو انہوں نے اپنی قوم کے قیدیوں کے بارہ میں اختیار کیا، یا جو روش انھوں نے سود کے معاملہ میں اختیار کی۔ نصاریٰ نے خنزیر اور گردن مروڑے ہوئے جانور کو جائز کر لیا۔

اسی طرح ان لوگوں نے تاریخ اور واقعات کو بھی مسخ کر کے اپنی خواہشات کے رنگ میں پیش کیا مثلاً حضرت ابراہیم علیہ السلام اور خانہ کعبہ کی تاریخ کے اکثر حصہ پر پردہ ڈال دیا گیا تاکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تعلق بیت اللہ سے ثابت نہ ہو سکے اور اس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق پیشین گوئیوں کو مسخ کیا جا سکے۔ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت ہاجرہ سے متعلق بیانات میں بھی اسی مقصد کے تحت بہت سے تصرفات کیے گئے۔ قرآن مجید نے ان تمام تحریفات کا پردہ چاک کیا اور اصل حقائق بے نقاب کیے۔ استاذ امامؒ نے رسالہ ذبیح میں ان چیزوں پر تفصیل کے ساتھ گفتگو کی ہے۔ آگے ہم بھی مناسب مواقع سے بعض مفید باتوں کی طرف اشارے کریں گے۔

شریعت اسلامی میں نسخ کی نوعیت

مذکورہ بالا تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ سورۂ بقرہ کی زیر بحث آیت کا تعلق تمام تر ادیانِ سابقہ سے ہے اور اس میں جس نسخ کا حوالہ ہے اس کی ضرورت اور اس کی حکمت اس قدر واضح ہے کہ کسی انصاف پسند کے لیے اس سے انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ رہا یہ سوال کہ اسلامی شریعت میں بھی نسخ ہے یا نہیں تو اس بارے میں ہمارے یہاں تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ ان لوگوں کا ہے جو نہ صرف نسخ کے قائل ہیں، بلکہ اس کو بہت زیادہ وسعت دیتے ہیں، دوسرا گروہ اس کا یک قلم منکر ہے، تیسرا گروہ اس کا قائل تو ہے لیکن اس کو صرف چند احکامات تک محدود مانتا ہے۔

ان میں سے پہلے گروہ نے اس کے دائرے کو جو بہت زیادہ وسعت دی ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ

اس کے نزدیک نسخ کا ایک خاص مفہوم ہے۔ یہ لوگ ان تمام مواقع میں بھی نسخ مان لیتے ہیں، جہاں کوئی بات کسی عام کو خاص یا خاص کو عام کر رہی ہو یا کسی اجمال کو تفصیل کا رنگ دے رہی ہو، حالانکہ اس طرح کے مواقع میں نسخ ماننے سے زیادہ معقول بات یہ ہے کہ عام و خاص اور مجمل و مفصل کے درمیان توفیق پیدا کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ توفیق نہایت آسانی کے ساتھ پیدا کی جا سکتی ہے۔

جو گروہ نسخ کا ایک قلم منکر ہے اس کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اسلامی شریعت کے احکام حالات کے تابع ہیں، جو احکام منسوخ ہوئے ہیں وہ صرف اس وجہ سے منسوخ ہوئے ہیں کہ جن حالات کے اندر وہ نازل ہوئے تھے، وہ حالات تبدیل ہو گئے۔ اب اگر وہی حالات دوبارہ پلٹ آئیں تو وہ احکام بھی از سر نو بحال ہو جائیں گے۔ اس وجہ سے جو احکام بظاہر منسوخ ہیں، وہ فی الحقیقت منسوخ نہیں ہیں بلکہ اپنے مخصوص حالات کے اندر بدستور قائم و زندہ ہیں۔ یہ گروہ اپنے نقطۂ نظر کی حمایت میں یہ بات بھی پیش کرتا ہے کہ اسلامی شریعت کا ارتقا بتدریج نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ اس وجہ سے جب حالات اس بات کے مقتضی ہو جائیں کہ نرمی کی طرف پلٹا جائے تو یہ پلٹنا اسلامی شریعت کے مزاج کے عین مطابق ہو گا۔

ہمارے نزدیک اس رائے میں متعدد غلطیاں ہیں۔

اوّل تو بجائے خود یہ دعویٰ ہی بالکل بے بنیاد ہے کہ اول اول شریعت ہلکی تھی، بعد میں یہ سخت ہوئی ہے۔ قرآن مجید پر غور کرنے سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ بعض احکام میں اس کا ارتقا اگر نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے۔ مثلاً تحریم شراب اور حکم صیام وغیرہ۔ تو بعض احکام میں سختی سے نرمی کی طرف بھی ہوا ہے۔ مثلاً صلوٰۃ اللیل اور تعداد متقاتلین کے معاملہ میں۔ اس وجہ سے یہ فارمولا بنا کر کہ شریعت کا ارتقا نرمی سے سختی کی طرف ہوا ہے نسخ کے بارے میں کوئی نتیجہ نکال لینا مغالطہ سے محفوظ نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اور ہمارے دور میں جو فرق ہے اس کو اس میں ملحوظ نہیں رکھا گیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اسلامی شریعت کی دنیا کو دعوت دی ہے اس وقت اسلام کی تعلیمات لوگوں کے لیے بالکل اوپری اور انوکھی تھیں، آپ کے صحابہؓ کی تعداد بہت تھوڑی تھی، لوگ جاہلی رسوم و عادات کے اتنے خوگر تھے کہ ان سے ان کے لیے نکلنا آسان نہ تھا۔ برعکس اس کے اس زمانہ میں حالات اس سے بہت مختلف ہیں۔ دنیا میں مسلمان کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ اسلامی احکام و قوانین لوگوں کے لیے کوئی نامانوس اور اجنبی چیز نہیں ہیں، اس وجہ سے اس زمانہ کو اس زمانہ پر قیاس کر کے ایک کے احکام کو دوسرے پر منطبق کرنا ہمارے خیال میں کسی طرح صحیح نہیں ہے۔

تیسری یہ کہ اگر حالات کی تبدیلی کے بہانے شریعت کے منسوخات کی طرف پلٹنے کے جواز کو تسلیم کر لیا جائے تو اس سے فتنہ پسند طبائع کے لیے شریعت سے فرار کی ایک ایسی راہ کھل جاتی ہے جس کا بند کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس زمانے میں بڑی آسانی کے ساتھ اس دلیل کے سہارے روزہ، نماز، حرمت شراب اور حدِ زنا

وغیرہ کے بارے میں سہولت پسند لوگ ایسے اجتہاد شروع کر دیں گے کہ دین کے معاملہ میں امان ہی اٹھ جائے گی۔ چنانچہ ماضی میں بھی گمراہ داعیوں کے ہاتھوں اس کا تجربہ ہو چکا ہے اور آج بھی اس کا تجربہ ہو رہا ہے۔ اسی چیز کی آڑ لے کر مبتدعین نے اپنے پیرؤوں کے لیے شریعت کی حرام کی ہوئی بہت سی چیزوں کو جائز ٹھہرا دیا، اور پھر ان کے اندر سے ان چیزوں کی حرمت کا احساس بھی رخصت ہو گیا۔

اس امر میں شبہ نہیں کہ بگڑے ہوئے ماحول میں بعض مرتبہ اچھے داعیان دین نے بھی نو واردوں اور نو مسلموں کے لیے شریعت کے بعض معاملات میں نرمی برتی ہے۔ لیکن اس نرمی کی وجہ ہرگز یہ نہیں تھی، کہ وہ حالات کی تبدیلی کے تحت شریعت کے منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے، بلکہ یہ اس قسم کی ایک چشم پوشی اور مسامحت تھی جس قسم کی چشم پوشی بعض مرتبہ ارباب اصلاح و تربیت اپنے کمزور اور بگڑے ہوئے مریدوں اور شاگردوں کے کسی معاملہ میں اختیار کر لیتے ہیں۔ اس نوع کی مسامحت حکیمانہ تربیت کا ایک جزو ہے۔ یہ اس توقع پر اختیار کی جاتی ہے کہ بالتدریج اس طرح کے خام لوگوں کی حالت صحبت اور تربیت سے اصلاح پذیر ہو جائے گی۔ تجربہ بتاتا ہے کہ اکثر حالات میں یہ توقع پوری بھی ہوتی ہے۔ بشرطیکہ تربیت کرنے والے خود تقویٰ کی صفات سے متصف رہے ہیں، محض گندم نمائی اور جو فروشی کی دکان نہیں چلاتے رہے۔ اس چیز کو اس امر پر محمول کرنا ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کہ یہ لوگ حالات کی تبدیلی کے تحت محکمات شریعت کو چھوڑ کر منسوخات کے اختیار کرنے کے قائل تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر ہم نسخ کے باب میں مذکورہ بالا دونوں مسلکوں کو کمزور سمجھتے ہیں۔ اب رہ گیا تیسرا مسلک یعنی ان لوگوں کا مسلک جو قرآن کی بعض آیات کو منسوخ مانتے ہیں، ہمارے نزدیک یہی مسلک صحیح ہے۔ رہی یہ بات کہ وہ آیات کون کون سی ہیں، وہ کن آیات سے منسوخ ہوئی ہیں اور ان کے منسوخ ہونے کی علت کیا ہے تو ان سوالوں کے جواب دینے کا یہ موقع نہیں ہے۔ اس کتاب میں اپنے اپنے موقع پر یہ بحثیں اللہ تعالیٰ نے چاہا تو آئیں گی۔ یہاں صرف چند اصولی باتیں ذہن نشین کر لیجیے۔

ایک تو یہ کہ قرآن کا کوئی حکم اگر منسوخ ہوا ہے تو قرآن ہی سے منسوخ ہوا ہے اور یہ ناسخ و منسوخ دونوں قرآن مجید میں موجود ہیں۔ قرآن کے کسی حکم کو قرآن کے سوا کوئی دوسری چیز منسوخ نہیں کر سکتی۔ بعض فقہا نے حدیث کو بھی قرآن کے لیے ناسخ مانا ہے، لیکن ہمارے نزدیک یہ مسلک صحیح نہیں ہے۔ اس مسلک کا ضعف اس قدر واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری یہ کہ اس نسخ کا تعلق تمام تر صرف احکام و قوانین سے ہے، عقاید و ایمانیات یا اخلاق و صفات یا واقعات و حقائق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ عقاید و ایمانیات اور واقعات و حقائق ایسی چیزیں نہیں ہیں جو آج کچھ ہوں اور کل کچھ اور بن جائیں۔ لیکن احکام و قوانین میں اگر کوئی ترمیم و اصلاح خود قانون کا دینے والا کر دے تو اس سے قانون کے مقصد کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔ بلکہ اس سے اصل مقصد کو تقویت

حاصل ہوتی ہے۔

تیسری یہ کہ اس نسخ کی ضرورت اس وجہ سے نہیں پیش آئی کہ نعوذ باللہ اللہ تعالیٰ کے علم میں کوئی نقص ہے جس کے سبب سے اس کے نازل کیے ہوئے قانون کو تجربات اور آزمائشوں کے مراحل سے گزرنا پڑا۔ بلکہ اس کی وجہ صرف بندوں کی بعض فطری خامیاں اور کمزوریاں ہیں، جن کے سبب سے وہ بسا اوقات کسی قانون کے قبول کرنے میں تدریج اور تربیت کے محتاج ہوتے ہیں اور اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے اس نے یہ پسند فرمایا کہ وہ اپنے قانون میں اس تدریج و تربیت کو ملحوظ رکھے۔

یہ تدریج اور تربیت قرآن کے ناسخ اور منسوخ احکام پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے، کہ مختلف تقاضوں کے تحت مختلف طرزِ عمل کی مقتضی ہوئی ہے، مثلاً

بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی ہے کہ معاشرہ کے ابتدائی حالات کے تقاضوں کی مناسبت سے کسی باب خاص میں کوئی عارضی حکم دیا جائے اور جب معاشرہ اپنے بلوغ کو پہنچ جائے تو اس عارضی حکم کو آخری اور کامل حکم سے بدل دیا جائے۔ مثلاً ابتداءً ورثہ کے حقوق کے تحفظ کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا، بدکاری کے سدباب کے لیے پنچائتی قسم کی تعزیر کی ہدایت کی گئی، انصار و مہاجرین کی اخوت کو اخلاقی اخوت سے بڑھا کر قانونی اخوت کا درجہ دیا گیا۔ لیکن بعد میں جب معاشرہ ایک اسلامی معاشرہ کی حیثیت سے اپنے پاؤں پر کھڑا ہو گیا تو وراثت کے آخری اور حتمی قانون اور زنا کی معین اور قطعی حد نے ان عارضی قوانین کو منسوخ کر کے خود ان کی جگہ لے لی۔

بعض حالات میں یہ اس امر کی مقتضی ہوئی کہ عام انسانی فطرت کا لحاظ کرتے ہوئے کوئی قانون درجہ بدرجہ اپنی آخری حد پر پہنچے، مثلاً شراب چونکہ اہل عرب کی گھٹی میں پڑی ہوئی تھی، اس وجہ سے ابتداءً یہ صرف نماز کے اوقات کے لیے حرام ہوئی، روزہ چونکہ عرب جیسے گرم ملک کے لیے بڑی سخت چیز تھا اس وجہ سے شروع شروع میں سفر اور مرض کی صورت میں فدیہ دے دینے کی بھی گنجائش رکھی گئی۔ لیکن بعد میں جب طبائع کو ان چیزوں سے اُنس ہو گیا تو شراب کے قطعی حرمت کے حکم، ماہ رمضان کی تعداد کی تکمیل کی ہدایت اور فدیہ کی اجازت کی منسوخی نے ان ابواب میں بھی شریعت کو کامل کر دیا۔ ان احکام کے بعد صرف اضطرار کے تحت ایک محدود و مشروط اجازت باقی رہ گئی۔

بعض صورتوں میں اس کا اقتضا یہ بھی ہوا ہے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو سابقہ شریعت کے کسی حکم پر عمل کرنے کے لیے کچھ عرصہ تک آزاد چھوڑ دیا گیا۔ لیکن بعد میں اس اجازت کو منسوخ کر کے اس کی جگہ اسلامی شریعت کا مستقل حکم دے دیا گیا۔ مثلاً قبلہ کے معاملہ میں، اس سے مقصود جیسا کہ قرآن میں واضح کیا گیا ہے مسلمانوں کا امتحان لینا تھا کہ کون خدا اور رسول کی وفاداری میں پختہ ہے اور کون اب تک اپنی پچھلی روایات ہی کا اندھا پرستار ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ امتحان تربیت ہی کا ایک جزو ہے۔

اسی طرح بعض حالات میں یہ اس بات کی مقتضی ہوئی کہ معاشرہ کی افرادی قوت کی کمی کی تلافی کے لیے وقتی طور پر بعض ایسے احکام بھی دیے جائیں جو کیفیت کو بڑھانے والے اور قلت تعداد کی حالت میں زیادہ بوجھ اٹھانے کی صلاحیت پیدا کرنے والے ہوں، مثلاً ابتداءً عام مسلمانوں کو بھی تہجد کی پابندی کا حکم دیا گیا، میدان جہاد میں ایک کو دس کفار کا مدمقابل قرار دیا گیا، جماعتی استحکام و تطہیر کے تقاضوں کے تحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی رازدارانہ بات کرنے سے پہلے صدقہ کی ہدایت کی گئی۔ بعد میں جب مسلمانوں کی افرادی قوت بڑھ گئی اور تطہیر جماعت کا وقتی مقصد حاصل ہو گیا تو ان چیزوں میں تخفیف کر کے ان کو اسی عام سطح پر کر دیا گیا جو پہلے سے ان کے لیے شریعت میں مقرر تھی۔

یہ ہم نے صرف بعض اصولی باتوں کی طرف اشارات کیے ہیں۔ یہاں پیش نظر تمام ناسخ و منسوخ آیات کا استقصا اور ان کے مصالح کی وضاحت نہیں ہے۔ تفصیلی بحث منسوخ آیات کے تحت جیسا کہ عرض کیا گیا اپنے اپنے مقام میں آئے گی۔

اس تمام تفصیل سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو گئی کہ خدا کی شریعت قرآن مجید میں اپنے ترقی و کمال کے آخری درجہ پر پہنچ چکی ہے۔ اب اس کے بعد کسی نسخ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس شریعت میں تمام احکام کے ساتھ مشکل اور مجبور کن حالات کے لیے رخصتیں اور رعایتیں بھی بیان کر دی گئی ہیں۔ اس وجہ سے حالات کی تبدیلی کے عذر پر منسوخ احکام کی طرف پلٹنے کے لیے بھی کوئی وجہ جواز باقی نہیں رہی، البتہ اہل بدعت کی پیدا کردہ ضلالتوں کے نسخ کا کام قیامت تک باقی رہے گا اور یہ کام اسلام میں علماء اور مصلحین کے سپرد ہے۔

۴۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۲۲-۱۴۱

حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت

اوپر کے مباحث سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو چکی ہے کہ اہل کتاب بالخصوص یہود کے لیے قبول اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ان کا یہ پندار تھا کہ وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس وجہ سے ہدایت ان کی ہدایت اور مذہب ان کا مذہب ہے۔ وہ اپنے دائرے سے باہر نہ کسی کے لیے نجات کے قائل تھے نہ کسی نبوت و رسالت کا تصور رکھتے تھے۔ نجات اور ہدایت حاصل کرنے کا واحد راستہ ان کے ہاں یہ تھا کہ آدمی یہودی بنے یا نصرانی۔ قرآن نے اوپر مختلف پہلوؤں سے ان کے اس زعم کی تردید فرمائی۔ اب آگے ان کے ان مزعومات کی تردید کے لیے ان کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے فرزندوں کی سرگزشت حیات کا وہ حصہ پیش کیا جا رہا ہے جس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت اور آپ کی رسالت کی تائید اور یہود و نصاریٰ اور مشرکین کے تمام دعاوی کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسمٰعیل دونوں ہی کے مورث اعلیٰ اور پیشوائے روحانی تھے، اس وجہ سے تاریخ کا یہ حصہ یکساں طور پر سب کے لیے حجت کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس پہلو سے دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ اس سورہ کے آغاز سے بنی اسرائیل اور ضمناً بنی اسمٰعیل

کے ساتھ جو بحث شروع ہوئی تھی وہ اس مقام پر آکر اپنے پورے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی ہے۔

یہاں جو باتیں قرآن نے اس سرگزشت کی روشنی میں واضح کی ہیں ان کی تفصیل تو آیات کی تفسیر کے ذیل میں آئے گی لیکن ہم خاص خاص اصولی باتوں کی طرف یہاں اشارہ کیے دیتے ہیں تاکہ کلام کا نظم اور تسلسل نگاہ کے سامنے آجائے۔ یہ اصولی باتیں مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو امامت و پیشوائی کا جو منصب اللہ تعالیٰ نے عطا فرمایا تھا وہ ان کو وراثت کے طور پر نہیں ملا تھا بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کا عطیہ تھا۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے مختلف امتحانوں میں ڈال کر ان کی اطاعت و وفاداری کی اچھی طرح جانچ کی، جب وہ اس جانچ میں پورے اُترے تب ان کو یہ منصب عطا ہُوا۔ یہ منصب تمام تر صفات پر مبنی ہے، اس کا کوئی تعلق بھی نسب اور خاندان سے نہیں۔ اس وجہ سے ان کی ذرّیت میں سے بھی وہی لوگ اس منصب کے سزاوار ہوں گے جو ان صفات کے حامل ہوں جو اس منصب کے شایانِ شان ہیں۔ بدعہد اور نافرمان لوگ اس کے حق دار نہیں ہو سکتے۔

۲۔ بیت اللہ کو اللہ تعالیٰ نے تمام ذریت ابراہیمؑ کے لیے مرکز قرار دیا، اس کو قبلہ بنانے کا حکم ہُوا اور حضرت ابراہیم و حضرت اسمٰعیل علیہما السلام کو اس کی تولیت سپرد ہوئی۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ و حضرت اسمٰعیلؑ نے اس گھر کی تعمیر کے وقت اپنی ذریت میں سے ایک اُمتِ مُسلمہ برپا کرنے اور ان کے اندر انھی میں سے ایک رسول مبعوث کرنے کی دعا کی تھی۔

۴۔ یہ پیغمبرؐ اسی دعائے ابراہیمیؑ کے مظہر اور اسی ملّتِ ابراہیمیؑ کے داعی ہیں۔ اس وجہ سے جو لوگ ملتِ ابراہیمیؑ کی پیروی کا دعویٰ رکھتے ہوئے ان کی دعوت سے گریز اختیار کر رہے ہیں وہ خود اپنے آپ کو بے وقوف ٹھہرا رہے ہیں۔

۵۔ اسی ملّتِ اسلام کی وصیت حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب علیہما السلام نے اپنی اپنی اولاد کو کی اور حضرت یعقوبؑ کی اولاد نے اسی ملّت پر جینے اور اسی ملّت پر مرنے کا حضرت یعقوبؑ سے عہد کیا۔

۶۔ ان تمام واقعات و حقائق کا تقاضا یہ ہے کہ اہل کتاب یہودیت یا نصرانیت کے تعصب میں مبتلا ہونے کے بجائے اس ملّت ابراہیمی کی پیروی کریں جس کی دعوت محمد صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں، خدا کے نبیوں کے درمیان کوئی تفریق نہ کریں بلکہ اس دینِ اسلام کو اختیار کریں جو مشترک طور پر تمام نبیوں اور تمام رسولوں کا دین ہے۔ جو لوگ اپنے آپ کو اللہ کے رنگ میں رنگنا چاہتے ہیں وہ اسلام کے رنگ کو اختیار کریں اور یہی رنگ اللہ کا رنگ ہے نہ کہ یہودیت اور نصرانیت۔ جو لوگ اس رنگ سے الگ کوئی رنگ اختیار کرنا چاہتے ہیں وہ اللہ اور اس کے رسولوں سے الگ اپنی پارٹی بنانے کے درپے ہیں۔

۷۔ یہ دعویٰ بالکل بے بنیاد ہے کہ ابراہیمؑ، اسمٰعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کے سلسلہ کے دوسرے انبیا علیہم السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ جو لوگ اس قسم کے دعوے کر رہے ہیں وہ حقیقت پر پردہ ڈال

رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان نبیوں کے دین و مذہب سے ان مدّعیوں کے مقابل میں زیادہ باخبر ہے۔

۸۔ آخری بات جو اس سلسلۂ کلام میں بطورِ ٹیپ کے بند کے تھوڑے تھوڑے وقفہ کے ساتھ دو مرتبہ کہی گئی ہے، وہ یہ ہے کہ اپنے جن آباؤ اجداد پر تم تکیہ کیے ہوئے ہو وہ اپنی زندگیاں گزار چکے اور اپنے اعمال اپنے ساتھ لے گئے، نہ ان کے کارناموں کا کریڈٹ تم کو ملے گا اور نہ ان کے کسی عمل کے بارے میں تم سے مواخذہ ہونا ہے۔

ان مطالب کو ذہن کے سامنے رکھتے ہوئے اب ان آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۱۲۲-۱۴۱

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّيْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِيْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴿۱۲۵﴾ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ ھٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿۱۲۶﴾ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۲۷﴾ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ

ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسۡلِمَةً لَّكَ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبۡ عَلَيۡنَا ۚ
اِنَّكَ اَنۡتَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ ﴿۱۲۸﴾ رَبَّنَا وَابۡعَثۡ فِيۡهِمۡ رَسُوۡلًا
مِّنۡهُمۡ يَتۡلُوۡا عَلَيۡهِمۡ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الۡكِتٰبَ وَالۡحِكۡمَةَ وَيُزَكِّيۡهِمۡ ؕ
اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِيۡزُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۱۲۹﴾ ع وَمَنۡ يَّرۡغَبُ عَنۡ مِّلَّةِ اِبۡرٰهٖمَ
اِلَّا مَنۡ سَفِهَ نَفۡسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصۡطَفَيۡنٰهُ فِى الدُّنۡيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى
الۡاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيۡنَ ﴿۱۳۰﴾ اِذۡ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗۤ اَسۡلِمۡ ۙ قَالَ
اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۱۳۱﴾ وَوَصّٰى بِهَآ اِبۡرٰهٖمُ بَنِيۡهِ وَيَعۡقُوۡبُ ؕ
يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصۡطَفٰى لَكُمُ الدِّيۡنَ فَلَا تَمُوۡتُنَّ اِلَّا وَاَنۡتُمۡ
مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۲﴾ اَمۡ كُنۡتُمۡ شُهَدَآءَ اِذۡ حَضَرَ يَعۡقُوۡبَ الۡمَوۡتُ ۙ اِذۡ
قَالَ لِبَنِيۡهِ مَا تَعۡبُدُوۡنَ مِنۡۢ بَعۡدِىۡ ؕ قَالُوۡا نَعۡبُدُ اِلٰهَكَ وَ
اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖۚ وَّ
نَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۳﴾ تِلۡكَ اُمَّةٌ قَدۡ خَلَتۡ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتۡ وَ
لَكُمۡ مَّا كَسَبۡتُمۡ ۚ وَلَا تُسۡئَلُوۡنَ عَمَّا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۳۴﴾ وَقَالُوۡا
كُوۡنُوۡا هُوۡدًا اَوۡ نَصٰرٰى تَهۡتَدُوۡا ؕ قُلۡ بَلۡ مِلَّةَ اِبۡرٰهٖمَ حَنِيۡفًا ؕ
وَمَا كَانَ مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ﴿۱۳۵﴾ قُوۡلُوۡۤا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنۡزِلَ اِلَيۡنَا
وَمَآ اُنۡزِلَ اِلٰٓى اِبۡرٰهٖمَ وَاِسۡمٰعِيۡلَ وَاِسۡحٰقَ وَيَعۡقُوۡبَ وَالۡاَسۡبَاطِ
وَمَآ اُوۡتِىَ مُوۡسٰى وَعِيۡسٰى وَمَآ اُوۡتِىَ النَّبِيُّوۡنَ مِنۡ رَّبِّهِمۡ ۚ لَا نُفَرِّقُ
بَيۡنَ اَحَدٍ مِّنۡهُمۡ ۖ وَنَحۡنُ لَهٗ مُسۡلِمُوۡنَ ﴿۱۳۶﴾ فَاِنۡ اٰمَنُوۡا بِمِثۡلِ

ع ۸ ۱۵

مَآ اٰمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۚ فَسَيَكْفِيْكَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳۷﴾ صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۡ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِي اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰى ۗ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ۗ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ۗ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْـَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾ ع ۱۶

ترجمۂ آیات ۱۲۲ - ۱۴۱

اے بنی اسرائیل میرے اس فضل کو یاد کرو جو میں نے تم پر کیا اور اس بات کو کہ میں نے تمھیں اہل عالم پر فضیلت دی اور اس دن سے ڈرو جس دن کوئی جان کسی کے کچھ کام نہ آئے گی اور نہ اس سے کوئی معاوضہ قبول ہوگا، نہ اس کو کوئی شفاعت نفع پہنچائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد ہی کی جا سکے گی۔ ۱۲۲ - ۱۲۳

اور یاد کرو جب کہ ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اس نے پوری کر دکھائیں، فرمایا بے شک میں تمھیں لوگوں کا پیشوا بناؤں گا۔ اس نے پوچھا اور میری اولاد میں سے؟ فرمایا میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے۔ ۱۲۴

اور یاد کرو، جب کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن کی جگہ بنایا اور حکم دیا کہ مسکن ابراہیم میں ایک نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم اور اسمٰعیل کو ذمہ دار بنایا کہ میرے گھر کو

طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں اور رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔ ۱۲۵

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی کہ اے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے باشندوں کو، جو ان میں سے اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان لائیں پھلوں کی روزی عطا فرما، فرمایا جو کفر کریں گے میں انھیں بھی کچھ دن بہرہ مند ہونے کی مہلت دوں گا۔ پھر میں ان کو دوزخ کے عذاب کی طرف دھکیلوں گا اور وہ بہت ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۲۶

اور یاد کرو جب کہ ابراہیمؑ اور اسمٰعیل بیت اللہ کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ انھوں نے دعا کی کہ اے ہمارے رب ہماری جانب سے یہ دعا قبول فرما بے شک تو سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۷

اے ہمارے رب ہم دونوں کو تو اپنا فرماں بردار بنا اور ہماری ذریت میں سے تو اپنی ایک فرماں بردار امت اٹھا اور ہمیں ہمارے عبادت کے طریقے بتا اور ہماری توبہ قبول فرما۔ بے شک تو توبہ قبول کرنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔ اور اے ہمارے رب تو ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرما جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے، بے شک تو غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۲۸ - ۱۲۹

اور کون ہے جو ملتِ ابراہیم سے اعراض کر سکے مگر وہی جو اپنے آپ کو حماقت میں مبتلا کرے۔ ہم نے اس کو دنیا میں بھی برگزیدہ کیا اور آخرت میں بھی وہ صالحین کے زمرہ میں ہو گا۔ جب کہ اس کے رب نے اس کو حکم دیا کہ اپنے آپ کو حوالہ کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے آپ کو پروردگارِ عالم کے حوالہ کیا۔ ۱۳۰ - ۱۳۱

اور ابراہیم نے اسی ملت کی وصیت اپنے بیٹوں کو کی اور اسی کی وصیت یعقوب نے اپنے بیٹوں کو کی، اے میرے بیٹو، اللہ نے تمھارے لیے دینِ اسلام کو منتخب فرمایا تو تم نہ مرنا مگر

اسلام کی حالت پر۔ ۱۳۲

کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوبؑ کی موت کا وقت آیا۔ جب کہ اس نے اپنے بیٹوں سے پوچھا تم میرے بعد کس کی پرستش کروگے؟ وہ بولے کہ ہم تیرے معبود اور تیرے آباؤ اجداد ابراہیمؑ، اسماعیلؑ اور اسحاقؑ —— کے معبود کی پرستش کریں گے جو ایک ہی معبود ہے اور ہم اسی کے فرماں بردار ہیں۔ ۱۳۳

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تمھیں ملے گا جو کچھ تم نے کمایا، اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہیں ہوگا۔ ۱۳۴

اور کہتے ہیں کہ یہود یا نصرانی بنو تو ہدایت پاؤگے۔ کہو بلکہ ابراہیمؑ کی ملت کی پیروی کرو جو اللہ کی طرف یک سو تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہماری طرف اتاری گئی اور جو ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ، یعقوبؑ اور ان کی اولاد کی طرف اتاری گئی اور اس چیز پر ایمان لائے جو موسیٰؑ و عیسیٰؑ اور نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے ملی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم صرف اسی کے فرمانبردار ہیں۔ ۱۳۶-۱۳۵

اگر وہ اس طرح ایمان لائیں جس طرح تم ایمان لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو پھر وہ درپئے مخالفت ہیں۔ ان کے مقابل میں تمھارے لیے اللہ کافی ہوگا وہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ ۱۳۷

کہہ دو، یہ اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ کے رنگ سے کس کا رنگ اچھا ہے اور ہم اسی کی بندگی کرتے ہیں۔ کہہ دو، کیا تم ہم سے اللہ کے بارے میں حجت کر رہے ہو۔ حالانکہ وہی ہمارا بھی رب ہے، وہی تمھارا بھی رب ہے۔ ہمارے لیے ہمارے اعمال ہیں اور تمھارے لیے تمھارے

اور ہم خالص اسی کے لیے ہیں۔ ۱۳۸ - ۱۳۹

کیا تم دعویٰ کرتے ہو کہ ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور ان کی ذریت کے لوگ یہودی یا نصرانی تھے۔ پوچھو تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ؟ ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کی کسی شہادت کو جو ان کے پاس ہے چھپائیں۔ اللہ اس چیز سے بے خبر نہیں ہے جو تم کر رہے ہو۔ ۱۴۰

یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا، اس کو ملے گا جو کچھ اس نے کمایا اور تم کو ملے گا جو کچھ تم نے کمایا اور جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں اس کے بابت تم سے سوال نہ ہوگا۔ ۱۴۱

۴۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِیَ الَّتِیْٓ اَنْعَمْتُ عَلَیْكُمْ وَاَنِّیْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (۱۲۲) وَاتَّقُوْا یَوْمًا لَّا تَجْزِیْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَیْـًٔا وَّلَا یُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ (۱۲۳)

یہ دونوں آیتیں معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ اوپر بھی گزر چکی ہیں اور وہاں ہم ان پر پوری تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ ملاحظہ ہو تفسیر آیات ۴۷، ۴۸۔

وَاِذِ ابْتَلٰٓی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ (۱۲۴)

ابتلا کا مقصد

ابتلاء کے معنی جانچنے اور امتحان کرنے کے ہیں۔ یہ ابتلاء بندوں کی تربیت اخلاقی کے لیے اللہ تعالیٰ کی ایک سنت ہے۔ اسی چیز سے بندوں کی وہ صلاحیتیں ابھرتی اور نشو و نما پاتی ہیں جو ان کے اندر اللہ تعالیٰ نے ودیعت فرمائی ہیں اور اسی سے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز ہوتا ہے۔ یہ امتحان نرم اور سخت، سرد و گرم، خوش کن اور رنج دِہ، حوصلہ افزا اور ہمت آزما دونوں طرح کے حالات کے ذریعہ سے ہوتا ہے اور کسی صورت میں بھی اس سے مقصود بندے کو دکھ میں مبتلا کرنا نہیں ہوتا بلکہ جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا صرف اس کی صلاحیتوں کو ابھارنا اور پروان چڑھانا ہوتا ہے۔ یہاں یہ اشارہ کافی ہے۔ آگے اس پر مفصل بحثیں آئیں گی۔

کلمات کا مفہوم

کلمات کلمہ کی جمع ہے۔ اس کے معنی مفرد لفظ کے بھی آتے ہیں اور پوری بات کے بھی۔ یہاں کلمات

سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ احکام ہیں جو اس نے حضرت ابراہیمؑ کی عزیمت و استقامت کے امتحان کے لیے ان کو دیے اور انھوں نے بے چون و چرا ان کی تعمیل کی۔ مثلاً انھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں عین اپنی قوم کے بتکدے میں اذان دی اور جو بت صدیوں سے معبود بن کر پج رہے تھے ان کو پاش پاش کر کے رکھ دیا۔ ان کو دینِ آبائی کی توہین کے جرم میں آگ میں ڈالا گیا، وہ بے خطر اس آگ میں کود پڑے۔ ایک جبار بادشاہ نے ان کو دینِ حق سے پھیرنا چاہا، انھوں نے حجتِ ابراہیمی سے اس کے چھکے چھڑا دیے۔ ان کو خاندان، جائداد اور قوم و وطن سب کو چھوڑ کر ہجرت کا حکم ہوا، وہ سب کو چھوڑ کر ہجرت کر گئے۔ ان کو دشتِ غربت میں اکلوتے اور محبوب فرزند کی گردن پر چھری چلا دینے کا حکم ہوا، انھوں نے بے دریغ اس بازی کے لیے بھی آستینیں چڑھا لیں اور سیزدہ سالہ فرزند کو ماتھے کے بل پچھاڑ دیا۔ حکمِ الٰہی کی تعمیل میں جان بازی و جان سپاری کے اس قسم کے عظیم کارناموں سے ان کی زندگی کا ہر ورق نورانی ہے۔ ہم نے صرف چند واقعات کی طرف بطورِ مثال اشارہ کر دیا ہے۔

یہاں اللہ تعالیٰ نے اپنے احکام و ہدایات کی تعبیر کے لیے کلمات کا جو لفظ استعمال فرمایا ہے اس میں بلاغت کا ایک خاص نکتہ مضمر ہے۔ وہ یہ کہ لفظ کلمہ ایک قسم کے اجمال و ابہام کا حامل ہے۔ یہ لفظ کلمہ کُن کی طرح ایک واجب التعمیل حکم کو تو مخاطب کے سامنے رکھ دیتا ہے لیکن ضروری نہیں کہ اس کے ساتھ اس کا فلسفہ، اس کا صلہ اور اس کا انعام بھی بیان ہو۔ وفاداری اور اطاعت کے امتحان کے لیے اس طرح کے احکام سب سے زیادہ سخت ہوتے ہیں، اس وجہ سے جو بندہ اس طرح کے امتحان میں بازی لے جاتا ہے اس کا اجر و انعام بھی بہت بڑا ہے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے خواب میں ایک اشارے کے طور پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بیٹے کو ذبح کر دینے کا حکم دے دیا، نہ اس کی علت و حکمت واضح فرمائی، نہ اس کا اجر و انعام بیان فرمایا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تو اس خواب کو صرف خواب کا درجہ بھی دے سکتے تھے اور چاہتے تو اس کی کوئی تعبیر بھی نکال لے سکتے تھے لیکن جس طرح اس کائنات کی ہر چیز خدا کے کلمۂ کُن کی تعمیل کرتی ہے، اس کو نہ تو اس کے فلسفہ سے بحث ہوتی ہے نہ اس کے اجر و ثواب سے، اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے رب کے ہر کلمہ کی تعمیل کی نہ اس کا فلسفہ پوچھا، نہ اس کا اجر و ثواب معلوم کیا۔ حکم ہوا آگ میں کود پڑو، کود پڑے۔ حکم ہوا، قوم و وطن کو چھوڑ دو، چھوڑ دیا۔ حکم ہوا بیٹے کی گردن پر چھری چلا دو، اس کو پچھاڑ دیا۔ ان امتحانی احکام کی اس مخصوص نوعیت کی وجہ سے قرآن نے ان کو کلمات کے لفظ سے تعبیر فرمایا۔

حضرت ابراہیمؑ سے بیٹے کی قربانی کا امتحان

یوں تو ان امتحانات میں سے ہر امتحان نہایت کٹھن تھا لیکن خاص طور پر بیٹے کی قربانی والا امتحان تو ایک ایسا امتحان تھا جس میں پورا اترنا تو الگ رہا، اس کا تصور بھی ایک عظیم امتحان تھا لیکن جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اس میں بھی پورے اتر گئے تو اللہ تعالیٰ نے ان سے یہ وعدہ فرمایا کہ اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا

دیں تم کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں) یہ ایک ہی وعدہ بیک وقت دو وعدوں پر مشتمل ہے، ایک تو اس پر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے عظیم قومیں پیدا ہوں گی، دوسرے اس پر کہ حضرت ابراہیمؑ ان سب کے پیشوا ہوں گے۔ اس عظیم انعام کے حق دار وہ اس وجہ سے قرار پائے کہ انھوں نے اللہ کی خاطر نہ صرف اپنے خاندان اور اپنی قوم کو چھوڑا بلکہ ایک دشتِ غربت میں اپنے اس اکلوتے فرزند کو بھی قربان کرنے پر آمادہ ہو گئے جو اس بڑھاپے اور اس تنہائی میں ان کی تمام تمناؤں کا واحد مرکز تھا۔ تورات میں اگرچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی سوانح کے خاص اس حصہ میں یہود نے بہت سی تحریفات کر دی ہیں تاہم یہ وعدہ تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتاب پیدائش باب ۲۲۔

"اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد اپنے دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کیوں کہ تو نے میری بات مانی" (۱۵-۱۸)

اس وعدے کے ایفا میں اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاقؑ اور حضرت اسماعیلؑ دونوں کی نسل سے عظیم قومیں پیدا کیں جن کے مورثِ اعلیٰ اور روحانی پیشوا بلا اختلاف حضرت ابراہیمؑ تھے۔ پھر ان کے اندر نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری ہوا۔ ان میں جلیل القدر بادشاہ پیدا ہوئے جو دشمنوں کے پھاٹکوں کے فاتح بنے۔ پھر انھی کی ایک شاخ میں پیغمبر خاتم (صلی اللہ علیہ وسلم) کی بعثت ہوئی جن کے واسطہ سے تمام دنیا کو ایمان و ہدایت کی برکت نصیب ہوئی۔

مشرکین اس وعدے سے مستثنیٰ ہیں

اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ جب ابراہیم علیہ السلام سے کیا تو انھوں نے سوال کیا کہ امامت و پیشوائی کا یہ عہد انھی کے ساتھ خاص ہے یا ان کی ذریت بھی اس میں شامل ہے۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ (میرا یہ عہد ان لوگوں کو شامل نہیں ہے جو ظالم ہوں گے) ظالم سے مراد قرآن میں صرف وہی لوگ نہیں ہوتے جو دوسروں پر ظلم ڈھانے والے ہوں بلکہ اس سے بیشتر وہ لوگ مراد لیے گئے ہیں جو شرک و کفر میں مبتلا ہو کر خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بن جائیں مثلاً۔ فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ (پس ان میں کتنے اپنے اوپر ظلم ڈھانے والے اور کتنے میانہ رو ہیں) فاطر ۳۲۔ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ (اور ان دونوں کی ذریت میں ٹھیک عمل کرنے والے بھی ہیں اور اپنی جانوں پر کھلا ہوا ظلم کرنے والے بھی) ۱۱۳ صافات۔ مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ تمھاری ذریت میں سے تمھاری روش پر قائم اور میری دی ہوئی شریعت و ہدایت پر استوار رہیں گے وہ تو تمھارے بعد اس امامت کے وارث ہوں گے لیکن جو بدعہدی اور نافرمانی کر کے شیطان کی راہ پر چل پڑیں گے وہ اس امامت میں سے کوئی حصہ نہیں پائیں گے۔

یہ تصریح یہاں اس لیے کی گئی ہے تاکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے کہ ان کو حضرت ابراہیمؑ کی ذریت ہونے پر جو ناز ہے اور جس کے سبب سے وہ ایمان اور عمل کی تمام ذمہ داریوں سے اپنے آپ کو سبکدوش سمجھے بیٹھے ہیں، یہ بالکل غلط ہے۔ ابراہیمؑ کی وراثت میں ان لوگوں کا کوئی حصہ نہیں ہے جو شرک و کفر میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیمؑ پر اسی روز واضح کر دی تھی جس روز ان کو اس منصبِ امامت پر سرفراز فرمایا تھا۔

ہمارا خیال ہے کہ اوپر ہم نے تورات کا جو حوالہ نقل کیا ہے، اس میں یہ تصریح بھی ضرور موجود رہی ہو گی لیکن چونکہ یہ بات یہود کے منشا کے خلاف تھی اس وجہ سے انہوں نے جس طرح اس سلسلہ کے واقعات میں دوسری بہت سی تبدیلیاں کر دیں، اسی طرح اپنی خواہش کے خلاف پا کر اس تصریح کو بھی انھوں نے حذف کر دیا۔ استاذ امامؒ نے اپنے رسالہ ذبیح میں ان تحریفات سے پردہ اٹھایا ہے۔ تفصیل کے طالب اس رسالہ کو ضرور پڑھیں۔

وَإِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَأَمْنًا وَاتَّخِذُوا مِن مَّقَامِ إِبْرَاهِيمَ مُصَلًّى ۖ وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ أَن طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّائِفِينَ وَالْعَاكِفِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ (۱۲۵)

'بیت' سے مراد بیت اللہ ہے

بیت سے مراد بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ ہے۔ قرآن مجید میں اس شکل میں یہ لفظ خانہ کعبہ ہی کے لیے استعمال ہوا ہے۔ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۲ میں اس کو بیت ایل سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایل عبرانی میں اللہ کو کہتے ہیں۔

'مثابۃ' کا مفہوم

مثابۃ کے معنی مرکز و مرجع کے ہیں، جس کی طرف سب رجوع کریں، جس کے ساتھ سب وابستہ ہوں، جو سب کا مرکز اور سب کا قبلہ ہو۔

'للناس' سے مراد

"للناس" سے یہاں مراد وہی لوگ ہیں جن کا ذکر اِنِّي جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا میں ہوا ہے۔ یعنی وہ تمام ذریت ابراہیمؑ جس کی امامت و پیشوائی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حاصل ہوئی عام اس سے کہ وہ حضرت اسحاقؑ کی نسل سے ہوں یا حضرت اسماعیلؑ کے سلسلہ سے ہوں۔ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی تمام ذریت کا پیشوا بنانے کا فیصلہ کیا گیا اسی طرح یہ فیصلہ بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ خدا کی عبادت کے لیے جو گھر وہ بنائیں گے وہ تمام ذریتِ ابراہیمؑ کا مرکز اور قبلہ ہو گا اور پھر ذریت اسماعیل کے واسطہ سے، جیسا کہ آگے ذکر آ رہا ہے، تمام دنیا کی قومیں اس گھر کی برکتوں میں سے حصہ پائیں گی۔

استاذ امام مولانا فراہیؒ اس مسئلہ میں اپنی تحقیق یہ بیان فرماتے ہیں۔

خانہ کعبہ کا ذکر تورات میں

تورات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کو شروع ہی سے یہ حکم ملا تھا کہ وہ اپنی بڑی قربانیوں کا قبلہ مکہ معظمہ کی سمت کو قرار دیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ قربانی کے لیے ضروری تھا کہ وہ معبد میں خداوند کے حضور پیش کی جائے۔ فصل دوم حرف ب میں ہم بتا چکے ہیں کہ جس قربانی کا نام ان کے ہاں قدس الاقدس

تھا اس کا رخ جنوب کی طرف ہونا ضروری تھا۔ اسی طرح سالانہ قربانی جوان کے ہاں سب سے بڑی قربانی خیال کی جاتی تھی اس کا رخ بھی جانب جنوب ہی ہوتا۔ یہود یا تو اس معاملہ کے اصلی راز سے بے خبر تھے جیسا کہ فصل دوم حرف ی میں ہم اس کی طرف اشارہ کر چکے ہیں یا انھوں نے بالقصد اس معاملہ کو کریدنا نہیں چاہا۔ بلکہ اپنی عادت کے مطابق چاہا کہ اس پر پردہ ہی پڑا رہے۔

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز

حالانکہ یہ بات پوری قطعیت کے ساتھ ثابت ہے کہ ان کے خیمہ عبادت کا رخ ابتداء سے جانب شمال تھا دیکھو سفر خروج ۲۷: ۹

مسکن کا گھر جنوب کی جانب برکت حاصل کرنے کے رخ پر بنایا جائے۔ نیز اسی سفر خروج کے باب ۴۰ آیت ۲۱-۲۴ میں ہے۔

"اور میز کو اس پردے کے باہر مسکن کی شمالی سمت میں خیمہ اجتماع کے اندر رکھا اور اسی پر خداوند کے حضور روٹی سجا کر رکھی جیسا کے خداوند نے موسیٰ کو حکم کیا تھا اور خیمہ اجتماع کے اندر ہی میز کے سامنے مسکن کی جنوبی سمت میں شمعدان رکھا۔"

ہمارے نزدیک اس ساری ترتیب کا اصلی فلسفہ یہ ہے کہ جو شخص خداوند کے حضور آئے اس کا رخ جانب جنوب یعنی مکہ معظمہ اور ابراہیمی قربان گاہ کی طرف ہو۔ اس کا مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ خیمہ کے اندر مسکن مقدس بھی جنوب ہی کی سمت میں تھا اور مذبح اس کے سامنے دروازے کی طرف تھا۔ اس لیے جو شخص وہ قربانی پیش کرتا جس کو قدس الاقداس کہتے ہیں وہ مذبح کے شمالی جانب کھڑا ہوتا تاکہ اس کا رخ مسکن ربانی کی طرف ہو سکے جس کے معنی یہ تھے کہ اس کا رخ لازماً خانہ کعبہ کی طرف ہوتا جس کے پاس ہی مروہ ہے جس کو اولین قربان گاہ ہونے کی عزت حاصل ہے اور اس کے پاس ہی مسکن اسماعیل بھی ہے۔"

(ملاحظہ ہو رسالہ ذبیح فصل ۱۵)

اس تفصیل سے واضح ہوا کہ جس طرح ہماری نمازوں اور قربانیوں کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اسی طرح ابتدا ہی سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام ذریت کی عبادت و قربانی کا قبلہ بھی خانہ کعبہ ہی کو قرار دینے کا فیصلہ ہوا تھا۔ چنانچہ اسی رخ پر ان کا خیمہ عبادت بھی تھا اور پھر بعد میں اسی رخ پر بیت المقدس کی بھی تعمیر ہوئی، لیکن یہود نے محض تعصب کی وجہ سے اس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی۔

آگے اس بات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے مولانا فراہیؒ فرماتے ہیں۔

"ہمارے مذکورہ دعاوی کی مزید تائید اس بات سے بھی ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مسکن کو تمام ذریت ابراہیمؑ کا قبلہ قرار دیا۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے

اپنی اولاد کو عرب کے مشرق اور شمال میں آباد کیا اور ان کا قبلہ حضرت اسماعیلؑ کے مسکن کو قرار دیا۔ چنانچہ تورات سے ثابت ہے کہ ان کو ان کے تمام بھائیوں کے آگے بسایا۔ پیدائش ۲۵: ۱۸ میں ہے۔

اور اس کی اولاد حویلہ سے شور تک جو مصر کے سامنے اس راستے پر ہے جس سے اسور کو جاتے ہیں، آباد تھی۔ یہ لوگ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسے ہوئے تھے۔

اور پیدائش ۱۶: ۱۲ میں ہے۔

"وہ گورخر کی طرح آزاد مرد ہو گا۔ اس کا ہاتھ سب کے خلاف اور سب کے ہاتھ اس کے خلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بسا رہے گا۔"

"سب بھائیوں کے سامنے بسنے" کی جو تاویل ہم نے کی ہے، اس کے سوا اس کی کوئی دوسری صحیح تاویل ممکن نہیں ہے کیونکہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تمام اولاد ماسوائے اسماعیل کے مشرق و شمال میں آباد ہوئی، پس حضرت اسماعیل ان سب کے سامنے اسی وقت ہو سکتے ہیں جب یہ مانا جائے کہ ان کی بستی ان سب کے قبلے کے سمت میں تھی۔ ہمارے نزدیک اس بات کو ماننے میں کسی تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ معلوم ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ نے سب کا امام بنایا تھا اور ان کے بعد اس امامت کے وارث حضرت اسماعیل ہوئے۔ قرآن مجید نے اس معاملہ کی طرف بعض اشارات کیے ہیں[1]۔ (آگے مولاناؒ نے وہی آیت نقل فرمائی ہے جو یہاں زیرِ بحث ہے)

وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى (اور مسکن ابراہیمؑ کے ایک حصہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ) یہ ٹکڑا اوپر والے ٹکڑے ہی کی مزید وضاحت ہے اس وجہ سے اس کے ساتھ "ہم نے کہا" یا "ہم نے حکم دیا" کی تصریح کی ضرورت نہیں تھی۔ دونوں جملوں میں ایک ہی بات دو مختلف پہلوؤں سے کہی گئی ہے۔ پہلے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو تمام اولادِ ابراہیمؑ کے لیے مرکز و قبلہ بنانے کا فیصلہ کیا۔ پھر یہ فرمایا کہ اسی فیصلہ کو بروئے کار لانے کے لیے ابراہیمؑ اور اولادِ ابراہیمؑ کو یہ حکم ہوا کہ مسکنِ ابراہیمؑ کے ایک حصّہ میں نماز کی ایک جگہ بناؤ۔

مقامِ ابراہیم سے مراد

یہاں آیت میں مقامِ ابراہیمؑ کا لفظ آیا ہے۔ مقام سے کیا مراد ہے؟ علمائے تفسیر سے اس بارے میں دو قول منقول ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے متعلق یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ دوسرے گروہ[2] کے نزدیک اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ اس گروہ نے مقام کے لفظ کو کسی مخصوص کھڑے ہونے کی جگہ کے بجائے مسکن و مستقر کے مفہوم میں لیا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی تاویل صحیح ہے۔ اس تاویل میں وسعت و جامعیت کے ساتھ ساتھ خاص اہمیت رکھنے والا

---

[1] ملاحظہ ہو مولانا فراہیؒ کا رسالہ ذبیح فصل ۱۶ [2] واضح رہے کہ اس گروہ میں ابن عباس، مجاہد اور عطا جیسے اکابرِ علمِ تفسیر شامل ہیں۔

پہلو یہ ہے کہ نظمِ کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرنے والی ہے جس کے لیے یہ بات یہاں کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ یہی گھر تمام اولادِ ابراہیمؑ کا قبلہ رہا ہے اس لیے کہ یہی گھر ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں حضرت ابراہیمؑ نے سب سے پہلے اپنے اس مستقر میں تعمیر کیا جس میں ہجرت کے بعد انھوں نے حضرت اسماعیلؑ کے ساتھ سکونت اختیار کی۔

ہمارے اور یہود کے درمیان نزاعی مسئلہ

یہ مسئلہ ہمارے اور یہود کے درمیان ایک بڑا نزاعی مسئلہ ہے۔ یہود نے خانہ کعبہ اور مروہ کی قربان گاہ سے حضرت ابراہیمؑ کا تعلق بالکل کاٹ دینے کے لیے واقعہ قربانی میں بھی اور ان کی سرگزشت ہجرت میں بھی نہایت بھونڈی قسم کی تحریفات کر دی ہیں اور اس طرح انھوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے جس بیٹے کی قربانی کی وہ حضرت اسحاق ہیں نہ کہ حضرت اسماعیل، جس جگہ قربانی کی وہ جبل یروشلم ہے نہ کہ مروہ۔ خدا کی عبادت کے لیے انھوں نے جو گھر بنایا وہ بیت المقدس ہے نہ کہ بیت اللہ۔ انھوں نے جس جگہ ہجرت کے بعد سکونت اختیار کی وہ کنعان ہے نہ کہ جوارِ خانہ کعبہ۔ ان بیانات کی تصدیق یا تردید کا واحد ذریعہ چونکہ تورات ہی ہے اور تورات میں یہود نے اپنے حسبِ منشا جیسا کہ ہم نے عرض کیا، تحریف کر ڈالی، اس وجہ سے اصل حقائق سے پردہ اٹھانا بڑا مشکل کام تھا لیکن ہمارے استاذ مولانا فراہیؒ نے یہود کی ان تمام تحریفات کا پردہ خود تورات ہی کے دلائل سے اپنے رسالہ ذبیح میں بالکل چاک کر کے رکھ دیا ہے۔ انھوں نے تورات ہی کے بیانات سے یہ ثابت کیا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے وطن سے نکلنے کے بعد حضرت اسحاقؑ کی والدہ کو تو کنعان میں چھوڑا اور خود حضرت اسماعیلؑ اور ان کی والدہ کے ساتھ بیر سبع کے بیابان میں قیام کیا۔ یہ جگہ ایک غیر آباد جگہ تھی اس وجہ سے انھوں نے یہاں سات کنوئیں کھودے اور درخت لگائے، یہیں ان کو خواب میں اکلوتے بیٹے کی قربانی کا حکم صادر ہوا اور وہ حضرت اسماعیلؑ کو لے کر مروہ کی پہاڑی کے پاس آئے اور اس حکم کی تعمیل کی۔ اسی پہاڑی کے پاس انھوں نے حضرت اسمٰعیلؑ کو آباد کیا۔ پھر یہاں سے لوٹ کر وہ بیر سبع گئے اور اپنے قیام کے لیے ایسی جگہ منتخب کی جو خانہ کعبہ سے قریب بھی ہو اور جہاں سے وقتاً فوقتاً حضرت اسحاقؑ کو دیکھنے کے لیے بھی جانا آسانی سے ممکن ہو سکے۔

مولاناؒ نے یہ ساری باتیں تورات کے نہایت ناقابلِ تردید دلائل سے ثابت کر دی ہیں۔ ہر سوال پر اصل کتاب کے اقتباسات پیش کرنے میں طوالت ہے اس وجہ سے ہم نے صرف خلاصۂ بحث اپنے الفاظ میں پیش کر دیا ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں وہ مولاناؒ کے مذکورہ رسالہ کا مطالعہ کریں۔

ظاہر ہے کہ جب حضرت ابراہیمؑ نے قیام اسی علاقہ میں فرمایا نہ کہ شام میں تو ان کو نماز کے لیے ایک مرکز کی تعمیر بھی اسی علاقہ میں کرنے کا حکم ہونا چاہیے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں انھوں نے اس بیت اللہ کی تعمیر کی جس کا ذکر تورات کی کتاب پیدائش میں بیت ایل کے نام سے ہوا ہے۔ بیت اللہ اور بیت ایل

دونوں کے معنی بالکل ایک ہیں سایل کے معنی عبرانی میں اللہ کے ہیں۔ اس بیت ایل سے اگر یہود بیت المقدس کو مراد لیتے ہیں تو قطع نظر اس سے کہ اس سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن نہیں بنایا، یہود کے اس دعوے کو جھٹلانے والی سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر بالاتفاق حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سیکڑوں سال بعد حضرت سلیمانؑ کے عہد میں ہوئی ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ کی اسی قدامت اور اولیت کی وجہ سے قرآن نے اس کو "بیت عتیق" اور "اول بیت" کے الفاظ سے بھی تعبیر کیا ہے۔ إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى لِّلْعَالَمِينَ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ وَمَن دَخَلَهُ كَانَ آمِنًا (۹۶-۹۷ آل عمران) (بے شک پہلا گھر جو لوگوں — اولاد ابراہیم — کے لیے تعمیر ہوا وہی ہے جو بکہ[1] میں ہے، مبارک اور تمام عالم کے لیے سرچشمہ ہدایت۔ اس میں (اس کی اولیت کی) نہایت واضح نشانیاں ہیں، یہ مسکن ابراہیم ہے (اور اس کی روایت ہے کہ) جو اس میں داخل ہوا وہ مامون ہوا)

بیت اللہ کی تعبیر مصلّٰے سے

یہاں بیت اللہ کو "مصلّٰی" کے لفظ سے جو تعبیر فرمایا ہے تو اس سے اس گھر کے اصل مقصد تعمیر کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ نماز کا مرکز ہوگا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس کے جوارِ رحمت میں حضرت اسماعیلؑ کو بساتے وقت دعا بھی یہی کی تھی کہ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلَاةَ (اے رب میں نے ان کو اس لیے یہاں بسایا ہے تاکہ یہ نماز قائم کریں) لیکن دورِ جاہلیت میں اس کے مشرک اور مبتدع متولیوں نے اس کو بدعات کا ایک اڈا بنا لیا اور ان کی نماز پھونک مارنے اور تالی بجانے کی ایک بت پرستانہ رسم بن کر رہ گئی۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہاں "مصلّٰی" کے لفظ میں ایک اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ ذریتِ ابراہیمؑ کی دونوں شاخوں نے اپنے قبلہ کے بنیادی مقصد کو ضائع کر دیا[2] اور اب خدا نے اپنے اس نبی کو بھیجا ہے جو اس کے اصلی مقصد کی تجدید کرتا ہے۔

وَعَهِدْنَا إِلَىٰ إِبْرَاهِيمَ الآية۔ عَهِدَ جب إِلَىٰ کے صلہ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنی کسی پر کوئی ذمہ داری ڈالنے یا اس کو کسی شرط کا پابند کرنے کے آتے ہیں مثلاً وَلَقَدْ عَهِدْنَا إِلَىٰ آدَمَ مِن قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهُ عَزْمًا (۱۱۵- طٰہٰ) (اور ہم نے اس سے پہلے آدم کو ایک شرط کا پابند کیا تو وہ بھول بیٹھا اور ہم نے اس میں ارادہ کی مضبوطی نہیں پائی) أَلَمْ أَعْهَدْ إِلَيْكُمْ يَا بَنِي آدَمَ أَن لَّا تَعْبُدُوا الشَّيْطَانَ (۶۰- یٰس)

---

[1] بکہ کے معنی شہر کے ہیں۔ قدیم صحیفوں میں مکہ کے لیے یہی لفظ وارد ہے۔ یہود نے تحریف کر کے اس کو وادی بکاء کر دیا ہے، متعلق آیت کی تفسیر کے تحت ہم اس تحریف پر بحث کریں گے۔

[2] یہ ملحوظ رہے کہ یہود نے جس طرح اپنے دینی لٹریچر سے خانہ کعبہ کے ذکر کو خارج کر دیا اسی طرح نماز کو بھی انھوں نے بالکل خارج کر دیا۔ ان کے ہاں اگر کوئی چیز ہے تو قربانی ہے۔ ان کے معبد کی بھی اصلی حیثیت مرکز نماز کی نہیں بلکہ قربان گاہ کی ہے۔ ہمیں کبھی کبھی یہ خیال ہوتا ہے کہ ان کے نماز کی نعمت سے محروم ہو جانے کی ایک وجہ یہ بھی ہوئی کہ انھوں نے اپنے اصل قبلہ خانہ کعبہ سے اپنا تعلق توڑ لیا۔

(کیا میں نے تم کو اس شرط کا پابند نہیں کیا تھا، اے آدم کے بیٹو، کہ تم شیطان کی بندگی نہ کرو گے) پس عَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر خانہ کعبہ کی تولیت کی ذمہ داری ڈالی اور ان کو اس شرط کا پابند کیا کہ وہ اس گھر کو طواف، اعتکاف اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک صاف رکھیں۔

تطہیر بیت اللہ کا مقصد

پاک صاف رکھنے سے مقصد ظاہر ہے کہ ان ساری چیزوں سے پاک صاف رکھنا ہے جو اس گھر کے مقصد تعمیر کے منافی ہوں عام اس سے کہ وہ گندگی اور نجاست ہو جس سے عبادت گزاروں کی طبیعت میں تکدر پیدا ہو، یا ارباب لہو و لعب کے ہنگامے ہوں جن سے ان کی یکسوئی میں خلل واقع ہو یا اصنام و اوثان ہوں جو خدا کے گھر کو شرک و بت پرستی کا گڑھ بنا کے رکھ دیں۔ ان ساری چیزوں سے اس گھر کو پاک رکھنے کی حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ پر ذمہ داری ڈال دی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا کیا لیکن بعد میں ان کی اولاد جب شرک و بت پرستی میں مبتلا ہو گئی تو اس نے اس گھر کی تولیت کی اس شرط کے برعکس اس کے کونے کونے میں بتوں کو لا بٹھایا اور ان لوگوں کو اس گھر سے نہایت ظلم اور بے دردی سے نکالا جو اس کو از سر نو ذکر الٰہی کے زمزموں، طواف و اعتکاف کی رونقوں اور رکوع و سجود کی جبہ سائیوں سے آباد و معمور کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے یہاں خانہ کعبہ کی ابتدائی تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اسی لیے اشارہ فرمایا ہے کہ قریش اس گھر سے متعلق اپنی ذمہ داریوں کو سمجھیں لیکن جب انھوں نے ان کو سمجھنے سے انکار کر دیا تو بالآخر اللہ تعالیٰ نے اس کی تولیت کے منصب سے ان کی معزولی کا اعلان کر دیا۔ مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ (توبہ ۹: ۱۷-۱۸) (مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اللہ کی مسجدوں کے منتظم بنے رہیں۔ درآنحالیکہ وہ خود اپنے کفر پر گواہ ہیں یہی لوگ ہیں جن کے تمام اعمال اکارت گئے اور دوزخ میں ہمیشہ رہنے والے یہی ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کے منتظم تو وہی ہو سکتے ہیں جو اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈریں)

یہاں اس گھر کو تین چیزوں کے لیے خاص کرنے کا حکم ہوا ہے۔ طواف، اعتکاف اور رکوع و سجود۔

'طواف' کا مفہوم

طواف سے مراد خانہ کعبہ کے ارد گرد پھیرے لگانا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت نے اس کا وہ طریقہ واضح فرما دیا ہے جو اس کا اصل ابراہیمی طریقہ ہے۔ طواف درحقیقت نماز کی ایک قسم ہے لیکن یہ نماز صرف خانہ کعبہ ہی کے پاس ادا ہو سکتی ہے اس کے سوا کہیں اور ادا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اس خصوصیت کی وجہ سے اس کا ذکر سب سے پہلے فرمایا۔ وقار و ادب کے حدود کے اندر رہتے ہوئے محبت الٰہی کے جذبات جس حد تک اس نماز میں ابھرتے ہیں بس اسی کے ساتھ مخصوص ہیں، شمع و پروانہ کی حکایت طواف میں ایک حقیقت بن جاتی ہے بشرطیکہ آدمی کے اندر حیات ایمانی کی رمق ہو۔

عاکف، عکوف سے ہے جس کی اصل روح دوسری چیزوں سے صرف نظر کر کے کسی خاص چیز کو پکڑ لینا ہے۔ اعتکاف کا مفہوم
اسی سے اعتکاف ہے جو دھیان گیان اور ذکر و فکر کی عبادت ہے۔ بندہ ہر چیز سے کٹ کر اپنے رب کی یاد کے لیے گوشہ نشین ہو جائے، یہ اعتکاف ہے۔ اس کی صحیح شکل نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی سنت سے واضح فرما دی۔ جس طرح طواف محبت الٰہی کے جذبات ابھارنے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے اسی طرح اعتکاف ذکر الٰہی پر عقل اور دل کو جمانے کے لیے اپنے اندر ایک خاص صفت رکھتا ہے۔

رکوع اور سجود کا مفہوم
رُکَّعٌ رَاکِعٌ کی جمع ہے اور سُجُوْدٌ ساجد کی۔ رکوع اور سجدہ کی لغوی تحقیق آیات ۴۳-۴۴ کی تفسیر کے تحت بیان ہو چکی ہے۔ یہاں یہ دونوں لفظ نماز کی تعبیر کے لیے وارد ہوئے ہیں۔ نماز کی تعبیر رکوع اور سجود سے دو اہم حقیقتوں پر روشنی ڈالتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ دونوں چیزیں نماز کے قدیم ترین اور اہم ترین ارکان میں سے ہیں۔ نماز کی ظاہری ہیئت میں جو تبدیلیاں بھی واقع ہوئی ہوں لیکن یہ دونوں چیزیں جس طرح ہماری نمازوں میں شامل ہیں اسی طرح ابراہیمی نمازمیں بھی شامل تھیں۔ دوسری یہ کہ نماز سے صرف ذکر و فکر ہی مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کی مخصوص صورت و ہیئت بھی مطلوب ہے اور اس کی صورت و ہیئت کا اصل جمال اس کے رکوع و سجود ہیں۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (۱۲۶)

سرزمین حرم کے دو خاص مسئلے
رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ (اے میرے رب اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور اس کے ساکنوں کو پھلوں کی روزی عطا فرما) آمن کے معنی مامون و مطمئن کے ہیں۔ یہ دعا حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین کے لیے فرمائی ہے جس پر حضرت اسماعیل علیہ السلام کو بسایا اور جہاں حرم کی تعمیر کی۔ یہ علاقہ جیسا کہ واضح ہو چکا ہے، تہذیب و تمدن اور آبادی و زرخیزی سے بالکل محروم تھا، خانہ بدوش قبائل پانی اور چراگاہوں کی تلاش میں موسموں کے تغیر کے ساتھ ساتھ ادھر سے ادھر منتقل ہوتے رہتے تھے۔ معاش کا ذریعہ یا تو گلہ بانی تھا یا شکار یا پھر لوٹ مار۔ اس وجہ سے اس سرزمین کے دو مسئلے خاص طور پر حضرت ابراہیمؑ کے زمانے میں بڑے اہم تھے، ایک امن کا، دوسرا غذا کا۔

حضرت ابراہیمؑ کی دعا کی قبولیت
حضرت ابراہیمؑ کی مذکورہ دعا انھی دو چیزوں کے لیے تھی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ دعا جس طرح قبول فرمائی اور اس کی جو برکتیں حضرت ابراہیمؑ کی ذریت اور اس علاقہ کے باشندوں کے لیے ظاہر ہوئیں وہ تاریخ کی ایک ایسی زندہ اور محسوس حقیقت ہے کہ کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی اس کا انکار نہیں کر سکتا۔ پھر عجیب ایمان پرور ماجرا یہ ہے کہ یہ دونوں چیزیں اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے واسطہ ہی سے لوگوں کو بخشیں۔ اس